سلسلے وار کتابیں "سوویت یونین کے تاثرات"

فیض احمد فیض

مہ و سالِ آشنائی

یادوں کا مجموعہ

دارالاشاعت ترقی - ماسکو

فیض احمد فیض

مہ و سالِ آشنائی

یادوں کا مجموعہ

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

Фаиз Ахмад Фаиз

Месяцы и годы знакомства

на языке урду

سوویت یونین میں شائع شدہ

Ф $\frac{11301-471}{014(01)-79}$ 664–78 0802010203

پیش لفظ - ۵

نمبر شمار	باب	عنوان	صفحہ
۱	پہلا	تصوّر	۷
۲	دوسرا	تعارف	۲۱
۳	تیسرا	مناظر	۴۷
۴	چوتھا	داغستان	۶۱
۵	پانچواں	مکالے	۷۴
۶	چھٹا	منظومات اور تراجم	۹۶

پیش لفظ

گزشتہ برس جب ماسکو میں مجھ سے فرمائش ہوئی کہ سوویٹ یونین کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کروں تو میں نے حسب معمول حامی بھر لی۔ اور پروگرس پبلشنگ ہاؤس کو کتاب کا خاکہ بھی بنا کر دے دیا لیکن یہ صرف خاکہ ہی خاکہ تھا ورنہ میرے ذہن میں بالکل صاف نہیں تھا کہ اس کتاب میں کیا لکھا جائے اور کیونکر لکھا جائے۔ آج سے کوئی سترہ برس پہلے (۱۹۵۸ء میں) جب سوویٹ یونین کو پہلی بار دیکھا تھا اور دل میں تاثرات کا ایسا ہجوم اور ذہن پر تحیّر اور انبساط کی وہ کیفیت طاری تھی جو ہر نئی دریافت کے جلو میں آتی ہے تو شاید اس نوع کی کتاب ایک ہی نشست میں لکھی جا سکتی تھی لیکن اتنے برس کے وقفے اور اتنی بار وہاں جانے کے بعد اس کیفیت سے دوبارہ لطف آشنا ہونا مشکل ہے، بہت سی دلکش یادیں دھندلا چکی ہیں۔ بہت سی دلچسپ باتیں فراموش ہو چکی ہیں اور ان کے جو نقوش باقی ہیں وہ بعد میں جو بہت کچھ دیکھا سنا ہے ان سے بہت حد تک خلط ملط ہو گئے ہیں۔ چنانچہ جب لکھنے کی باری آئی تو ان فرد فرد پارہ ہائے خیال کی شیرازہ بندی کا کوئی تسلی بخش نسخہ ہاتھ نہ آیا اور اسی وجہ سے کتاب کی تکمیل کی جو میعاد طے پائی تھی اس کی پابندی بھی نہ ہو سکی۔ آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ تقدیم و تاخیر اور ترتیب و تالیف پر زیادہ توجہ دیئے بغیر جو بات جس صورت ذہن میں آئے قلم برداشتہ لکھتا چلوں اور یہی میں نے کیا ہے، صرف داغستان کے بارے میں ایک مضمون پہلے سے لکھا رکھا تھا جو شامل کر لیا ہے، باقی یہ کتاب نہ تو کسی صحافی کی رپوتاژ ہے نہ کسی مبصر کا تجرباتی مطالعہ، ایک تماشائی دوست کی پراگندہ یادداشتیں ہیں جن سے ان لوگوں کی معلومات میں تو شاید کوئی اضافہ نہ ہو جو سوویٹ یونین دیکھ چکے ہیں یا اس کے بارے میں بہت کچھ پڑھ چکے ہیں، لیکن دوسرے پڑھنے والوں کے لئے جنہیں یہ اتفاق میسر نہیں آسکا شاید یادوں کے اس پراگندہ البم

میں ایک آدھ تصویر دلچسپی کا باعث ہو اور اس وسیلے سے وہ اس عظیم سرزمین اور اس کے رہنے والوں سے کچھ قربت محسوس کر سکیں۔ اگر ایسا ہو تو جیسا کہ سب لوگ ہر کتاب کی ابتدا میں لکھتے آتے ہیں میں بھی سمجھوں گا کہ یہ محنت اکارت نہیں گئی، اگرچہ اس کتاب کے لکھنے میں محنت کا دخل کم تھا اور محبت کا زیادہ، محنت طلب باتیں یعنی تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، اعداد و شمار وغیرہ وغیرہ محنتی لوگوں نے پہلے ہی سے متعلقہ کتابوں میں لکھ رکھی ہیں جو شائقینِ علم کے لئے آسانی سے دستیاب ہیں۔

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

کتاب کے مسوّدے کی ترتیب و تدوین، کتابت اور پروف پڑھنے کے جملہ مراحل میرے عزیز اور کرم فرما مرزا ظفر الحسن اور ادارۂ یادگارِ غالب کراچی کی پُرخلوص کاوش اور عرق ریزی سے طے پائے، اس احسان کے لئے انتہائی شکر گزار ہوں۔

فیض احمد فیض

ماسکو، اگست ۱۹۷۵ء

پہلا باب

تصوّر

۱۸ء، ۱۹ء، ۱۹۲۰ء صرف زمانہ ہے۔ صحیح مہ وسال کا اندازہ اس عمر میں کس کو تھا، بچپن کی سب سے پرانی دھندلی سی یادیں۔ پہلی عالمگیر لڑائی ختم ہوچکی ہے ایک جانب انگریز حکمران اوران کے دیسی حاشیہ بردار جشنِ فتح منا رہے ہیں سڑکوں پر رنگین جھنڈیاں لگائی جارہی ہیں، توپیں دغ رہی ہیں، بینڈ باجے اور فوجی سوار گشت کررہے ہیں۔ دوسری طرف قومی آزادی کی تحریک شروع ہوچکی ہے، آئے دن جلسے جلوس، نعرے، "جو بولے سو نہال، ست سری آکال، نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر، قومی نعرہ "بندے ماترم" "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" "آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے" بڑے بڑے لیڈر پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیوں میں شہر سے گزر رہے ہیں۔ یہ موتی لال نہرو ہیں، یہ محمد علی اور شوکت علی ہیں، یہ ابوالکلام آزاد ہیں، یہ بابا کھڑک سنگھ ہیں، یہ ڈاکٹر کچلو ہیں۔ جگہ جگہ خوش آمدید کے لئے دروازے سجائے گئے ہیں اور کوچہ و بازار میں تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں، آج ترکوں کی کسی فتح کی خوشی میں شہر میں چراغاں ہو رہا ہے، تو کل کسی لیڈر کی گرفتاری پر سارے شہر میں ہُو کا عالم ہے۔

انہیں یادوں میں کہیں گڈمڈ اخباروں کی شہ سرخیاں ہیں اور اخبار بیچنے والوں کا غوغا ہے، "روس میں زار شاہی کا تختہ الٹ گیا" "لینن نے مزدور طبقے کی حکومت قائم کرلی" "سرخ انقلاب آگیا" جگہ جگہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے گھر کے دیوان خانے میں، اسکول کے اسٹاف روم میں، محلے کی مسجد میں، ہر جگہ ایک ہی تذکرہ ہے۔ یہ روسی انقلاب کیسے ہوا، کیونکر ہوا، کیا انقلابی فوجیں ہندوستان پہنچ کر ہمیں بھی آزاد کرا لیں گی ہ مزدوروں، کسانوں کی حکومت کیسی

ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جب ابا کچہری چلے جاتے تو گلی محلے کے لوگ باگ جو ہمارے گھر کے آس پاس دکان یا کاروبار کرتے تھے اس گھر کے بیرونی چبوترے پر آ جمع ہوتے جہاں ابا کے مؤکلوں کے لیے بینچ اور مونڈھے وغیرہ پڑے رہتے تھے۔ کوئی گاہک آ گیا تو جلدی سے اسے نپٹا کر پھر آ بیٹھے۔ اللہ دیا پہلوان، چراغ دین تیلی، اللہ رکھا قصاب، خوشیا حجام اور ان کے یار دوست گھنٹوں ملکی اور غیر ملکی سیاست پر گپ لڑاتے رہتے "ارے بھئی کچھ سنا بھی ہے، مہاتما گاندھی اور محمد علی شوکت علی نے مل کر اعلان کر دیا ہے کہ "ایک سال کے اندر اندر سب انگریز، لاٹ، کمشنر، ڈپٹی کمشنر نکال دیتے جائیں گے اور ان کی جگہ ہمارے لوگ لگاتے جائیں گے" اور "بھئی یہ بھی تو سنا ہے کہ غازی کمال پاشا کی فوجیں انگریزوں کو ہرا کر افغانستان کی طرف سے آ رہی ہیں۔" "ہاں ہاں، روسی فوجیں بھی تو ان کے ساتھ مل گئی ہیں، روس کے بادشاہ زار کا تختہ تو الٹ گیا ہے نا! وہاں کوئی لیڈر پیدا ہوا ہے، لینن۔ اس نے مزدوروں کی فوج بنائی ہے اور بادشاہ کو بھگا کر سب روپیہ پیسہ لوگوں میں بانٹ دیا ہے" اور "مزدوروں کا راج بھی بنا دیا ہے۔" "شاباش شیر دے پتر، یار اپنے آغا صفدر سے کہو وہ بھی کوئی ترکیب لڑائیں، کچھ ہمارا بھی بھلا ہو" (آغا صفدر شہر کے سیاسی لیڈر تھے) "کوئی ایسی ترکیب لڑ جائے تو مزہ آ جائے، یہ سامنے والے ساہوکار لالہ ہرجس رائے کا مال بٹے تو ہم سب کے وارے نیارے ہو جائیں۔"

روس، لینن اور انقلاب کی بات ان بھولے بسرے دنوں میں پہلی بار کان پڑی تھی اور اب کچھ اندازہ نہیں کہ ہمارے طفلانہ ذہن نے ان کے بارے میں کیا تصور باندھا ہو گا، پھر ہم ذرا بڑے ہو کر اسکول میں پڑھنے لکھنے اور دوسری دلچسپیوں میں کھو گئے اور یہ سب کچھ بھول بھال گئے۔

کئی برس کے بعد سر زمین روس کی ایک اور تصویر ذہن میں ابھرنے لگی۔ (سوویٹ یونین کے نام سے ابھی ہم پوری طرح آشنا نہیں تھے) یونیورسٹی میں ایم۔ اے کی ڈگری کے لئے انگریزی ادب اور خاص طور سے اٹھارھویں اور انیسویں صدی کا ادب میرا مضمون تھا، انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ

اس عہد کے باقی یورپی ادب کا مطالعہ بھی لازمی تھا، کچھ ہم شوقیہ بھی اِدھر اُدھر کی کتابیں پڑھتے رہتے تھے اور یوں روس کے کلاسیکی ادب سے تعارف ہوا، چنانچہ گوگل، پشکن، دوستوئیفسکی، ترگنیف، ٹالسٹائے، چیخوف، باری باری سب کو بہت ڈوب کر پڑھا اور پرانے روس کی پوری دنیا نظر میں گھوم گئی۔ بے زبان اور بے کس کسان، عیاش اور خود پسند امراء، دل پھینک نوجوان اور عاشق مزاج محبوبائیں، قلاش انقلابی نوجوان، اور اپاہج دانشور، بے نور نکڑی کے گھروندے اور جگمگاتے ہوئے محلات، گھنے جنگل اور لق و دق میدان، صحرا اور دریا، جنگیں، معاشقے، سازشیں، رقابتیں، نتاشا، پرنس بولکونسکی، اینا کرینا، اوبلوموف، چچاوانیا، کراموزوف خاندان، ظلم اور اس کا توڑ، جبر اور جذبہ بغاوت، اداسی اور رنگینی، نیکی اور بدی، ذلت اور شرافت، فلم کے پردے کی مانند طرح طرح کے مناظر نظر سے گزرنے لگے، قسم قسم کے کردار، رنگ رنگ کے جذبات، معاشرے کی مختلف قوتوں میں مسلسل کش مکش اور پیکار کا عالم اور اس کے پس منظر میں ایک کلبلاتی ہوئی پراسرار سرزمین، نیم تاریک، نیم ویران اور یخ بستہ جس کی بسیط خاموشیوں میں وقفے وقفے سے کبھی خونخوار بھیڑیے ہونکتے تھے، کبھی کسی رئیسانہ گاڑی کی سُریلی گھنٹیاں سنائی دیتی تھیں، کبھی سائبیریا روانہ ہونے والے مجرم قافلے کے ماتمی گیت فضا میں ابھرتے تھے، اور اس دھرتی کے باسی، آشفتہ سر، جذباتی، دل گرفتہ لوگ، خواستہ ناخواستہ کسی انجانی منزل کی جانب رواں تھے جو صرف چند بالغ نظر لوگوں پر عیاں تھی، پھر جس طرح پرنس آندرے بالکونسکی اس بم کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا جس سے اس کے تنومند جسم کے پرخچے اڑنے والے تھے اور کاؤنٹ کروپوٹکن ایسی ہی بے بسی میں اپنا گھر لٹتا ہوا دیکھ رہا تھا اسی طرح ان لوگوں کا حکمران طبقہ دنیا و مافیہا سے غافل اپنی معین تباہی کی جانب کھنچا چلا جا رہا تھا۔

کالج میں میرے دو چار اور ہم جماعت بھی اس سرزمین اور اس کے رہنے والوں سے اسی طرح مسحور تھے اور ہم لوگ گھنٹوں بیٹھ کر ان کلاسیکی کتابوں اور ان کے کرداروں کا تجزیہ کرتے رہتے۔ لیکن ہم اس پرانی دنیا میں اتنے کھوئے رہے کہ انقلاب کے بعد کی نئی سوویٹ دنیا پر ہم نے زیادہ توجہ نہیں کی

البتہ اس دنیا کے وجود کا کچھ موہوم سا احساس ہمیں ضرور تھا۔ وہ اس وجہ سے کہ صدی کی دوسری دہائی کے آخر میں گلی کوچوں میں تو نہیں لیکن بعض نوجوان حلقوں میں لینن، سوشلزم اور انقلاب کا چرچا ضرور ہونے لگا تھا۔ برصغیر میں یہ دہشت پسند تحریک کے عروج کے دن تھے، چٹاگانگ آرمی کیس، کاکوری ڈکیتی کیس، بھگت سنگھ، آزاد، شیر جنگ، گھر گھر یہی تذکرہ تھا۔ میرٹھ سازش کیس وغیرہ کا ہم پہلے سے سُن چکے تھے، بھگت سنگھ تحریک میں میرے دو تین قریبی دوست بھی شامل تھے اور ان کے سرغنے خواجہ خورشید انور نے جواب مشہور میوزک ڈائرکٹر ہیں ہوسٹل میں میرے کمرے کو اپنے خفیہ لٹریچر بانٹنے کا اڈہ بنا رکھا تھا۔ یہ تحریریں بیشتر کارل مارکس، لینن اور انقلابِ روس سے متعلق تھیں اور کبھی کبھار سرسری نظر سے میں بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قریب قریب ہر روز، کبھی کوئی انقلابی پوسٹر کالج کے نوٹس بورڈ پر چسپاں نظر آتا، کبھی روزانہ اخبار کی تہہ میں چھپا ہوا ملتا۔

اس تحریک کے زیرِ اثر قومی جلسے جلوس کا رنگ بھی بدل گیا، اب ان میں سوراج اور بندے ماترم کے بجائے انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہوتے تھے اور

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا"

کی جگہ

"سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے"

گایا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں شیخ عبداللہ نے کشمیر میں مہاراجہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، ایک طالب علم نے سینیٹ ہال میں گورنر مانٹ مورنسی پر گولی چلائی، بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے اسمبلی میں بم گرایا، اور کئی انقلابی اقدامات کی خبریں آئیں، ان سب باتوں سے انقلابِ روس کے بارے میں بچپن کی یادوں کے کچھ نقوش دوبارہ ابھر آتے لیکن ان پر دوستوئیفسکی اور ٹالسٹائی کی بنائی ہوئی تصویر ابھی تک غالب تھی۔

پھر اس تصویر پر دھیرے دھیرے ایک اور تصویر اترنے لگی۔

اب ہم تعلیم ختم کر کے روزگار کی تلاش میں تھے۔ یہ عالمی کساد بازاری اور اقتصادی بحران کا زمانہ

تھا۔ غلّہ کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگا تھا اور بھوکے کسان دو وقت کی روٹی کی خاطر دھرتی ماتا سے ناتہ توڑ کر شہروں میں در بدر ہو رہے تھے۔ بے روزگاری کا انت نہ تھا اور ملازمت کا نشان مفقود، شریف رذیل ہو رہے تھے اور عزّت دار گھروں کی بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھی تھیں۔ صرف سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی چاندی تھی جو دونوں ہاتھوں سے حاجت مندوں کے اثاثے کے ساتھ ساتھ ان کی عزّت اور غیرت بھی سمیٹ رہے تھے۔ جہاں تک مجھے علم ہے برِّصغیر کی سیاست پر اس بحران کے اثرات کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اس مطالعے سے بہت سی سیاسی تحریکوں کے ابتدائی محرّکات اور عوامل پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ اس بحران سے پہلے بدیسی سامراج اور قومی آزادی کا مسئلہ تو سب کی نظر میں تھا ہی، اب نئے حالات نے قومی دولت کی تقسیم، امیری اور غریبی، مزدور اور سرمایہ دار، کسان اور زمیندار، بندگی اور خواجگی غرض کہ جملہ معاشی اور معاشرتی مسائل کا پہاڑ بھی سامنے لا کھڑا کیا اور ذی شعور لوگ اسے سر کرنے کی فکر میں سر کھپانے لگے۔ کسان سبھائیں بنیں، مزدور تحریک نے زور پکڑا، اور قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سوشلزم اور سماجی عدل و مساوات کے تقاضے بھی عام ہونے لگے۔

۱۹۳۵ء میں جب میں نے امرتسر کے ایک کالج میں پڑھانا شروع کیا تو نوجوان اساتذہ میں انہی مسائل پر بحث رہتی تھی۔ ایک دن میرے ایک رفیقِ کار صاحبزادہ محمود الظفر (مرحوم) نے ایک پتلی سی کتاب میرے حوالے کی اور کہا لو یہ پڑھو اور اگلے ہفتے اس پر ہم سے بحث کرو، لیکن غیر قانونی کتاب ہے اس لئے ذرا احتیاط سے رکھنا، یہ کتاب تھی کمیونسٹ مینی فیسٹو جو میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی بلکہ دو تین بار پھر پڑھی۔ انسان اور فطرت، فرد اور معاشرہ، معاشرہ اور طبقات، طبقے اور ذرائع پیداوار کی تقسیم، ذرائع پیداوار اور پیداواری رشتے، پیداواری رشتے اور معاشرے کا ارتقا، انسانوں کی دنیا کے پیچ در پیچ اور تہہ بہ تہہ رشتے ناتے، قدریں، عقیدے، فکر و عمل وغیرہ وغیرہ کے بارے میں یوں محسوس ہوا کہ کسی نے اس پورے خزینۂ اسرار کی کنجی ہاتھ میں تھما دی ہے۔ یوں سوشلزم اور مارکسزم سے اپنی دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔ پھر لینن کی کتابیں پڑھیں اور یوں لینن کے اکتوبر انقلاب اور اس

کی انقلابی سرزمین سے واقفیت کی شدت سے طلب ہوئی۔ انقلاب کے بارے میں جان ریڈ کی کتاب
TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD پڑھی۔ وسط ایشیا کے
بارے میں کنٹز کی کتاب DAWN OVER SAMARKAND مطالعہ کی اور پھر
سوویٹ معاشرے کے بارے میں سڈنی اور بیٹرس ویب کی کتاب، ڈین ہیولیٹ جانسن،
مارس ڈاب در لندن کے لیفٹ بک کلب کی شائع کردہ دوسری کتابیں پڑھیں۔ ان سب کتابوں کا داخلہ
اس وقت ملک میں ممنوع تھا اور انہیں اپنے پاس رکھنا بھی جرم تھا اسی لیے ان پر کوئی اور سرورق چپکا کر
رکھا جاتا، کسی آنے جانے والے کے ہاتھ منگوایا جاتا اور پھر یہ چوری چھپے ہاتھوں ہاتھ شائقین تک پہنچتیں۔
کتابوں کے علاوہ ہمارے ہاں دو تین بزرگ ایسے بھی تھے جو انقلاب کا ابتدائی دور اپنی آنکھوں سے دیکھ
چکے تھے، ایک تو ہمارے پرانے دوست فضل الٰہی قربان ہیں جن کے ساتھ ہم نے ٹریڈ یونین میں کام شروع
کیا تھا، ایک دادا فیروزدین منصور (مرحوم) تھے جو بعد میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری بنے
اور جن کے ساتھ جیل خانے میں بہت سا وقت گزرا۔ ان سے وسط ایشیا میں انقلابی جدوجہد کے قصے
سنے جنہیں بیان کرنے کے لیے ایک الگ کتاب درکار ہے۔ پھر کچھ ترقی پسند نوجوان تعلیم ختم کر کے یورپ
سے واپس آئے، جن میں سید سجاد ظہیر تھے، ڈاکٹر تاثیر تھے، زیڈ اے احمد تھے، بعد میں ملک راج آنند
بھی کچھ دنوں کے لیے آئے تھے۔ یہ لوگ سوویٹ یونین گئے تو نہیں تھے لیکن یورپ میں بہت سے لوگوں
سے وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سن چکے تھے اور اس بارے میں بہت سا لٹریچر بھی اپنے ساتھ لاتے تھے۔ اسی
زمانے میں ہندوستانی ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم ہوئی اور سوویٹ انقلابی ادیبوں کی کتابیں نوجوان لکھنے
والوں کا وظیفہ بن گئیں۔ گورکی، مایاکوفسکی، شولوخوف، الکسی ٹالسٹائے، ایلیا اہرن برگ اور جس کا بھی
انگریزی ترجمہ دستیاب ہوا، ذوق و شوق سے پڑھا گیا۔ سعادت حسن منٹو جو بعد میں اردو زبان کے بہت
اہم افسانہ نگار بنے قریب قریب ہم عمر ہونے کے باوجود ان دنوں کالج میں رسمی طور سے میرے شاگرد
تھے۔ رسمی طور سے اس لیے کہ وہ کلاس میں تو شاید ہی کبھی نظر آتے ہوں لیکن کالج بند ہونے کے بعد ہر دوسرے
چوتھے دن وہ کسی نہ کسی روسی ادیب کی کتاب اور اپنا ترجمہ اٹھائے میرے ہاں بحث یا اپنے ترجمے کی ترمیم د

تفریح کے لئے آیا کرتے۔

یہ سب کچھ پڑھ کر، سُن کر ہم نے اس دوسری تصویر میں رنگ بھرنے شروع کیے۔ ایک آزاد، غیر طبقاتی معاشرے کی تصویر جہاں کوئی سرمایہ دار نہیں، کوئی جاگیردار اور زمیندار نہیں، نہ کوئی آقا ہے، نہ کوئی بندہ، نہ کوئی تلاشِ معاش میں سرگرداں ہے نہ فکرِ فردا میں گرفتار، جہاں مزدور کسان راج کرتے ہیں اور ہر معاملہ ان کی مرضی سے طے پاتا ہے۔

مزدور کسان راج سے ایک قصہ یاد آیا۔ چند برس پہلے کی بات ہے، ہماری بیٹی سلیمہ لندن سے ماسکو کے راستے پاکستان جا رہی تھی اور مجھے ماسکو سے اس کے ساتھ روانہ ہونا تھا، اسی جہاز میں پاکستان کے کچھ ناخواندہ دیہاتی لوگ بھی سوار تھے جو انگلستان میں اپنے مزدور عزیزوں سے ان کے خرچ پر مل کر آ رہے تھے۔ ماسکو سے شری متوا ایرپورٹ پر ہمارے کچھ دوست ہمیں وداع کرنے کو آئے ہوئے تھے، ان سے رخصت ہو کر ہم جہاز میں سوار ہوئے ساتھ کی نشست پر کوئی ایسے ہی دیہاتی بزرگ پہلے سے بیٹھے تھے، مجھے دیکھ کر بولے "آپ کوئی وزیر ہیں؟"

میں نے کہا "نہیں"

"کوئی بڑے افسر ہیں؟"

"نہیں"

"بزنس مین ہیں؟"

"نہیں"

"تو پھر اتنے لوگ آپ کو چھوڑنے کیوں آئے تھے؟"

میں نے بتایا کہ یہ سب لوگ اپنے پرانے دوست ہیں اس لئے آئے تھے۔

"اچھا، تو یہ کون سا ملک ہے؟"

"روس، اسے سوویٹ یونین بھی کہتے ہیں۔"

"یہاں کا بادشاہ کون ہے؟"

"یہاں بادشاہ تو کوئی نہیں ہے" میں نے کہا "اپنے بادشاہ کو تو ان لوگوں نے بہت پہلے ہٹا دیا تھا، اب تو یہاں مزدوروں کسانوں کی حکومت ہے۔"

"او ہو" بڑے میاں کچھ متاسف ہو کر بولے "ہم نے تو سنا تھا روس بہت بڑا اور امیر ملک ہے لیکن اگر یہاں کے حاکم بھی ہم جیسے مزدور کسان لوگ ہیں تو یہ بہت ہی غریب ملک ہو گا۔"

خیر بات یہ ہو رہی تھی کہ اس زمانے میں ہم نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سنا اس کے مطابق سوویٹ انقلاب اور سوویٹ معاشرے کے خیالی نقشے ذہن میں ترتیب دینے شروع کئے، لینن گراڈ شہر، سمالنی انسٹی ٹیوٹ، جنگی جہاز آرورا، کریملن کا محل، تاشقند، سمرقند اور بخارا کے قدیم آثار، سفید روسی اور ان کے غیر ملکی حلیفوں کی منظم، ترتیب یافتہ پیشہ ور فوجوں سے انقلابی مزدور دستوں کی نبرد آزمائی جو ہتھیاروں سے زیادہ اپنے زور بازو اور جوش ایمان کے بل پر لڑ رہے تھے۔ وسط ایشیا میں تو ان معرکوں کا کچھ آنکھوں دیکھا حال ہم اپنے بزرگ دوستوں کی زبانی بھی سن چکے تھے، یہ لوگ ۱۹۱۹ء/۱۹۲۰ء میں خلافت کی ہجرت تحریک کے زیر اثر گھر بار کو خیر باد کہہ کر اپنے خیال سے جہاد کی خاطر ترکی کو پیادہ پا روانہ ہوئے تھے لیکن وسط ایشیا کی انقلابی سرزمین میں پہنچ کر گھر لوٹنے تک وہیں کے ہو رہے۔ ان کی زبانی سنا ہے کہ جب ان کا بے سروسامان قافلہ کوہ ہندوکش کی برف اور افغانستان کے دشت و دریا سے گزر کر ازبکستان میں داخل ہوا تو اس علاقے میں قدم قدم پر انقلاب کے حامی اور مخالف مسلح دستوں میں جدال و قتال کا بازار گرم تھا۔ اس جنگ میں مورچوں اور صف بندی کا کوئی سوال نہیں تھا آج ایک علاقہ انقلابیوں کے ہاتھ میں ہے تو کل ان کے دشمنوں کے تصرف میں۔ چنانچہ یہ لوگ کبھی اسیر ہوتے، کبھی چھڑائے گئے حتیٰ کہ باقاعدہ سرخ فوج کے کسی دستے نے انہیں اپنی حفاظت میں لے کر بخارا پہنچایا جہاں سے امیر بخارا اپنی کنیزوں اور مغنیوں کا انبوہ ساتھ لے کر چند دن پہلے فرار ہو چکے تھے۔ اس پا فگار، برہنہ سر، گریباں چاک قافلے کو امیر ہی کے محل میں ٹھہرایا گیا اور یہ بھی اذن ملا کہ محل کے توشہ خانوں میں خلعتوں، غرغلوں اور شال دوشالوں کا جو ڈھیر ہے ان میں سے جو چاہیں اپنے لئے پسند کر لیں۔ میں نے یہ محل دیکھا ہے، اس میں باقی سب کچھ تو وہی ہے جو ہمارے راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے محلات میں ہوتا ہے، وسیع باغ،

غلام گردشیں، دربار ہال، جھاڑ، فانوس وغیرہ وغیرہ لیکن ایک چیز مجھے ذرا عجوبہ معلوم ہوئی۔ باغ میں ایک بڑا شفاف پانی کا تالاب ہے جس کے کنارے کچھ چوبی سیڑھیاں ہیں جن کے اوپر ایک شہ نشین صورت کا چبوترا سا بنا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ ہر سال جب امیر کی مملکت سے حسین دوشیزائیں کنیزیں بنا کر لائی جاتیں تو انہیں اس تالاب کے کنارے جمع کیا جاتا، اس چبوترے پر امیر کا تخت سجایا جاتا اور وہ ایک سیب ہاتھ میں لے کر اس تخت پر متمکن ہو جاتے، پھر ان کنیزوں کو حکم ہوتا کہ وہ کپڑے اتار کر اس تالاب میں نہائیں اور ان میں سے جو بھی امیر کی نظر میں کھب جاتی امیر صاحب یہ سیب اس کی طرف پھینک دیتے اور اگلے دن وہ شاہی حرم میں داخل ہو جاتی۔ نہ جانے یہ روایت صحیح ہے یا غلط لیکن اپنے ہاں کے بعض پرانے امرا کے لچھن دیکھے جائیں تو کچھ ایسی بعید از قیاس بھی نہیں۔

تو ہمارے دوست سناتے ہیں کہ ان کا مستقل قیام تو تاشقند میں رہا لیکن انہیں آذر بائیجان اور گرجستان کے رستے ماسکو جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں لینن کی زیر قیادت انقلابی معاشرے کی بنیاد ڈالی جا رہی تھی۔ ادھر کئی سمت سے ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کی یلغار تھی، ادھر نظم و نسق کا پرانا نظام درہم برہم ہو چکا تھا، بنک، ریلیں، ڈاک خانے، رسل و رسائل، کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں تھا، بھوک فاقہ، بے سر و سامانی، یہ سب کچھ ایک طرف اور دوسری جانب عوام میں ایک عجیب سرخوشی کا عالم اور سوویٹ کمیٹیوں کی قیادت میں تعمیر نو کی ان تھک جدوجہد جس میں لینن سے لے کر ایک عام مزدور تک دن رات یکساں مصروف تھے۔ یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں تندہی سے کام ہو رہا تھا لیکن رسل و رسائل کی درستی، بجلی کی فراہمی، تعلیم اور ثقافتی سرگرمیوں پر خاص زور دیا جا رہا تھا، فلمیں بن رہی تھیں، ڈرامے کھیلے جا رہے تھے، گانے لکھے جا رہے تھے، کہیں گھروں میں بچے اپنے والدین کو سبق دے رہے تھے کہیں اسکول کی لڑکیاں کارخانوں میں کڑیل مزدوروں کی استانیاں بنی بیٹھی تھیں، مختصراً یہ انقلاب مولانا روم کے شعر کی جیتی جاگتی مثال تھی۔

ہر بنائے نو کہ آباداں کنند
اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے اگلے تعمیری دور کا حال ہم نے ان کتابوں میں پڑھا جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ان سے

اندازہ ہوتا تھا کہ ایک پوری قوم چیونٹی دل کی طرح اس رہنا ئے نوکے اینٹ روڑے منزل پر منزل جارہی ہے، نئی بستیاں بسائی جارہی ہیں، نئی زمین آباد ہو رہی ہے، نہریں کھد رہی ہیں، کانیں دریافت ہو رہی ہیں، ریلیں اور سڑکیں بچھائی جارہی ہیں، نئے عظیم الشان کارخانوں میں نئی دیو ہیکل مشینیں کھڑکھڑا رہی ہیں اور سرزمین کی اس کایا پلٹ کے ساتھ ساتھ ایک نیا انسان بھی پروان چڑھ رہا ہے جسے پیسے کی ہوس نہیں، بڑھاپے، بیماری اور بیروزگاری کا ڈر نہیں، اولاد کی فکر نہیں، اور جسے اس نئے معاشرے نے اخلاق، آداب اور اقدار کے بالکل نئے ذہنی نظام سے روشناس کیا ہے۔

ادھر ہم نے یہ پڑھ سن رکھا تھا اور ادھر انگریزی اور دیسی رجعت پسند پروپیگنڈے کے زیر اثر سوویٹ یونین کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جارہی تھیں۔ "انقلاب نے زار روس کی عظیم الشان سلطنت کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اس معاشرے کی کوئی بھی کل ٹھیک نہیں، نہ دین ہے نہ اخلاق ہے، گھریلو زندگی ختم ہو چکی ہے، جس کا جی چاہے جتنے دن جی چاہے کسی کے ساتھ رہ لے اور پھر کسی اور سے رنگ رلیاں منائے، بچوں کو حکومت لے جاتی ہے جہاں انہیں جبراً کمیونسٹ بنایا جاتا ہے، سارا ملک ایک بیگار کیمپ ہے، جہاں مجبور اور بیکس لوگوں سے سخت مشقت لی جاتی ہے اور صرف موٹا جھوٹا پہننے کو اور دال روٹی کھانے کو دی جاتی ہے، ہر چیز کا توڑا ہے، کسی بات کی آزادی نہیں اور لوگوں کی سخت مصیبت میں جان ہے"!

جب سوویٹ یونین میں جانے آنے پر کافی بندشیں تھیں اور بہت کم لوگ یہاں کے حقیقی حالات سے واقف تھے اس لئے بہت سے لوگ یہ سب باتیں آسانی سے ہضم کر لیتے تھے۔ تعجب اس بات پر ہے کہ اس طرح کے قصے آج کل بھی چلتے رہتے ہیں حالانکہ اس زمانے میں ہزاروں سیّاح یہاں ہر روز آتے جاتے ہیں اور بلا روک ٹوک یہاں کے حالات کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بہرحال ہم نے اس دور کی جو تصویر اپنے ذہن میں قائم کی تھی وہ بھی کافی رومانی اور مثالی تصویر تھی جس کی ہر تفصیل حقیقت پر مبنی نہیں تھی۔

یہ دوسری تصویر مکمل نہ ہو پائی تھی کہ اس پر ایک تیسری تصویر کا تاثر شروع ہوئی۔

۱۹۲۹ء کے وسط میں میں نے مزید تعلیم کے لئے کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ ایک اطالوی

بحری جہاز میں جگہ بھی مخصوص کروائی تھی، ٹکٹ خرید لیا تھا، کپڑے بنوا لیے تھے بس روانگی کا انتظار تھا۔ جہاز کے جانے میں کوئی دس دن باقی تھے جب خبر آئی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے اور ملک سے باہر آنے جانے کے سب راستے بند ہو گئے ہیں، اس کے ساتھ ہی ملک میں بائیں بازو کی جماعتوں پر انگریز حکومت کا تزلہ گرا۔ جو معروف کارکن تھے سب گرفتاری کے بعد راجستھان میں دیولالی کیمپ میں نظر بند کر دیئے گئے، جو روپوش تھے ان کی کھوج میں گھر گھر چھاپے پڑنے لگے، ممنوعہ لٹریچر کی برآمد کے لئے تلاشیاں ہونے لگیں، ادھر کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور فرداً فرداً گرفتاں پیش کر رہے تھے۔

یہ کافی ہنگامہ آرا دن تھے۔ میں نے امرتسر کو خیر آباد کہہ کر لاہور کے ایک کالج میں ملازمت کر لی تھی۔ ان دنوں ہم جیسے لوگوں کو جو گزشتہ کئی برس سے ہٹلر ازم اور فاشزم کے خلاف لکھنے لکھانے میں بھی مصروف تھے اور انگریزی سامراج کے خلاف عمل طور سے مصروف کار بھی، ایک عجیب ذہنی خلجان کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جاپانی جنگ بازوں اور نازی ستم رانوں نے ہماری یہ مشکل جلد ہی حل کر دی، ادھر جاپانیوں کے فوجی دل سارے مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا کو تاخت و تاراج کر کے برصغیر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے اور ادھر فاشسٹ حملہ آوروں کے سیاہ بادل سارے یورپ کو پامال کر کے سوویٹ سرزمین پر منڈلانے لگے۔

اور اب یہ تیسری تصویر نظر میں اترنے لگی، سوویٹ یونین کے میدان کارزار کی تصویر۔

اس تصویر کو میں نے ذرا زیادہ قریب سے دیکھا ہے، جب تین طرف سے فاشسٹوں کا ریلا یعنی مشرق سے برما، مغرب سے شمالی افریقہ اور شمال سے جنوبی روس کی طرف بڑھنے لگا تو اپنا دیس بھی اس سہ شاخہ یورش کی زد میں نظر آنے لگا اور میں نے ہندوستانی فوج میں ملازمت کر لی۔ دوسرے فرائض کے علاوہ میرے ذمے ایک کام یہ بھی تھا کہ مختلف محاذوں سے جو خبریں روزانہ وائرلیس پر موصول ہوتی تھیں انہیں یکجا کر کے ریڈیو کے لیے ایک جنگی خبرنامہ اور اس پر تبصرہ تیار کروں۔ یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے جب قریب قریب ہر محاذ پر انگریز اور امریکن اتحادی فوجیں پسپا ہو رہی تھیں ہمارے اور فاشسٹ حملہ آوروں کے درمیان اگر کوئی دیوار کھڑی نظر آ رہی تھی تو وہ سوویٹ یونین ہی کے عوام اور سپاہی تھے جو قدم قدم پر غنیم سے مصروف وغا تھے، ہم نے ان

فوجوں کے اعلیٰ کمانڈروں کے نام سنے ژدکوف، کوہنف تموشنکو، بڈیمنی، رکوسوفسکی، میلی نوفسکی، گوورووف وغیرہ چھاپہ مار گوریلا بہادروں کے کارنامے پڑھے، زویا، متروسوف، گاستلو اس زمانے میں ہمارے بعض دوستوں کے ہاں جو بچے پیدا ہوتے، ان کے نام بھی انہیں کے ناموں پر رکھے گئے اور نومولود لڑکیوں کے لیے زویا بہت مقبول نام قرار پایا۔ مختلف محفلوں میں میدان جنگ کا نقشہ سامنے رکھ کر ہر معرکہ کے نشیب و فراز پر بحثیں ہوتیں؛ شمال، جنوب، مشرق، مغرب، کتنے محاذوں پر بیک وقت کہاں کہاں خون بہہ رہا تھا، شمال میں نوودگراڈ، پسکوف، لینن گراڈ، مغرب میں مینسک، سمولینسک، جنوب میں کیف، ڈونیتز، خارکوف، روستوف آن ڈان؛ کس کس میدان پر کیا حشر بپا تھا اور ہر مقام پر محض پیشہ ور سپاہی نہیں پوری قوم کے بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد کس بے جگری سے لڑ رہے تھے، ان کی روداد ممتاز سوویٹ ادیبوں کی نظم و نثر میں نظر سے گزری۔ ایلیا اہرن برگ، شولوخوف، سمونوف، سرکوف، پولے وائے اور بہت سے جانے اَن جانے ادیبوں سے غائبانہ شناسائی ہوئی، مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھوں تعمیر کی ہوئی ان کی نئی دنیا شہر، بستیاں، تفریح گاہیں، درسگاہیں، بجلی گھر، کارخانے، تجربہ گاہیں، کھیت اور باغات ان سب کی تباہی اور بربادی اور ان کو بچانے کے لیے سرفروشی کی داستانیں۔ اسی زمانے میں اہرن برگ نے اپنی کسی تحریر میں ایک جملہ لکھا تھا جو اب تک دل پر کندہ ہے وہ کچھ یوں تھا کہ "میاں بیوی آپس میں ناتے توڑ سکتے ہیں، محبتیں چھوٹ سکتی ہیں اور عاشق و محبوب جدا ہو سکتے ہیں لیکن ایک رشتہ جو کسی صورت نہیں ٹوٹ سکتا ماں بیٹے کا رشتہ ہے اور ہمارا وطن ہماری ماں ہے۔"

جب تک ہمارے سب دوست اسیری سے رہا ہو چکے تھے، کمیونسٹ پارٹی اور دوسری بائیں بازو کی جماعتوں پر سے پابندیاں اٹھ چکی تھیں اور سب کی نظریں ان مختلف محاذوں پر جمی تھیں، ان کے بارے میں نظمیں لکھی گئیں، گیت گائے گئے، ڈرامے کھیلے گئے، آل انڈیا ریڈیو پر پہلی بار سوویٹ یونین کے حق میں زبان کھولنے کی اجازت ملی اور لکھنؤ کے ایک ریڈیو کے مشاعرے میں جہاں ہم سب لوگ جمع تھے، مجازؔ، سردار جعفری، جذبیؔ، جان نثار اختر وغیرہ۔ مخدوم محی الدین (مرحوم) نے قازق شاعر جمبل کا منظوم ترجمہ اپنی انتہائی شیریں آواز میں سنایا۔

صفِ اعداء کے مقابل ہے ہمارا رہبر

ان دنوں مجھے ہر روز خبر نامہ تیار کرنے کی وجہ سے کم از کم یورپی سوویٹ یونین کا پورا جغرافیہ اتنا حفظ ہو چکا تھا کہ کسی سوویٹ طالب علم کو بھی نہ ہو گا۔ ہم سب کی نظریں امید و بیم کے عالم میں ان سب محاذوں پر جمی تھیں۔ ہمیں تو نظریاتی وجوہ سے یقین تھا کہ فاشسٹ یہ جنگ نہیں جیت سکتے لیکن سب لوگ ہمارے ہم خیال نہیں تھے۔ شروع شروع میں تو کچھ کوتاہ اندیش لوگ انگریز امریکن فوجوں کی ہزیمت پر خوش تھے اور اس مغالطے میں مبتلا تھے کہ جاپانی یا جرمن اطالوی فوجیں انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا دیں گی لیکن جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانیوں کے مظالم اور یورپ میں فاشسٹوں کی چیرہ دستیوں کے سبب یہ خوش فہمی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی، تاہم یہ اندیشہ عام پایا جاتا تھا کہ فاشسٹ دیو کے خلاف سوویٹ انسان زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے گا۔ چنانچہ جب ماسکو اور لینن گراڈ چاروں طرف سے محصور ہو گئے تو ہمارے فوجی دفتر میں شرطیں بدنے لگیں کہ یہ شہر کتنے دنوں میں فتح ہوں گے، کوئی تین ہفتے کہہ رہا تھا کوئی ایک مہینہ۔ میں نے ایک انگریز دوست سے ایک اور تین کی بازی لگا دی کہ یہ شہر فتح نہیں ہوں گے اور آخر کار میں جیت گیا۔

اور پھر اسٹالن گراڈ کی جو اب والگا گراڈ کہلاتا ہے، تاریخی لڑائی شروع ہوئی، اب دنیا بھر میں اتحادی طاقتوں سے دوسرا محاذ کھولنے کے تقاضے ہو رہے تھے لیت و لعل جاری تھا تاہم سبھی لوگ محسوس کر رہے تھے کہ جیت ہار کا فیصلہ اسی لڑائی پر ہے۔ ہم بھی دور سے سانس تھامے اس کا نظارہ کرتے رہے، آج اس محلّے میں دونوں طرف جان کی بازی لگی ہے تو کل اس بازار میں کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں۔ آخر کار جب سوویٹ فوجیں جیت گئیں تو ہندوستان میں بھی خوشی کے شادیانے بجے، پھر کچھ عرصے کے بعد جرمن کمانڈر فان پالس کی ذاتی گاڑی اور ایک ٹینک نمائش کے لئے نئی دہلی لائے گئے۔ کناٹ سرکس کے بیچوں بیچ چمن میں ان کی نمائش ہوئی، جھنڈیاں لگائی گئیں، بینڈ بجائے گئے اور سب خلق خدا دیکھنے کو آئی۔

جنگ کی یہ تصویر بیک وقت بھیانک بھی تھی اور ولولہ انگیز بھی۔ اس کے بعد جب فاشسٹ طوفان چڑھ کر اتر گیا، اتحادیوں کی فتح ہو گئی اور برلن پر سرخ جھنڈا لہرانے لگا تو اسی تصویر کے بہت سے نقوش دلوں

پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہو گئے۔

یہ تھے وہ تاثرات جو مختلف اوقات میں، مختلف صورتوں میں ہمارے دل و دماغ پر وارد ہوتے رہے۔ اب طلب یہ تھی کہ ان کی تصدیق کیسے کریں اور یہ کیسے دیکھیں کہ سوویٹ سرزمین اور وہاں کا معاشرہ سچ مچ میں کیسا ہے اور وہاں کس نوع کی مخلوق بستی ہے۔

تعارف

۱۹۴۹ء ستمبر اکتوبر کا مہینہ۔ ہم لوگ لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کانفرنس کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے کہا کہ کیوں نہ سوویٹ ادیبوں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ سوویٹ یونین سے پاکستان کے سفارتی تعلقات تو کافی دن پہلے قائم ہو چکے تھے لیکن ابھی تک آپس میں میل جول کا کوئی سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا، اس لئے یہ توقع تو نہیں تھی کہ وہاں سے کوئی آئے گا۔ محض اظہارِ دوستی کے لئے دعوت نامہ بھجوا دیا گیا اور جب ہمیں ایک دن تار ملا کہ روسیوں کا وفد لاہور کے لئے روانہ ہو چکا ہے تو خوشی ہوئی اور کچھ تعجب بھی۔ یہ لوگ کانفرنس کے دوران میں نہ پہنچ سکے۔ دو چار روز بعد آئے جو شاید ایک طریقے سے اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ کانفرنس کے آخری اجلاس میں کچھ ناسمجھ لوگوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ مار پیٹ بھی ہوئی۔ جلسے کا تو کچھ نہیں بگڑا لیکن اگر باہر کے مہمان موجود ہوتے تو ضرور بُرا لگتا۔ مقررہ وقت پر ہم لوگ لاہور کے پرانے ایرپورٹ پر مہمانوں کو لینے پہنچے۔ میاں افتخار الدین مرحوم، سی۔ آر۔ اسلم، احمد ندیم قاسمی، مظہر علی خان اور ان کی بیگم طاہرہ، صفدر میر، عبداللہ ملک، حمید اختر، شمیم اشرف، اشرف ملک اور دوسرے دوست۔ ہوائی جہاز سے مہمانوں کا وفد برآمد ہوا، نکولائی تخونوف، اناتولی سفرونوف، مرزا ترسون زادہ، موسی ایبک اور ان کے ایک ذرا ڈراؤنی صورت کے ترجمان۔ وضع قطع صورت شکل میں سب ایک دوسرے سے مختلف۔ تخونوف جو اکتوبر انقلاب میں شامل رہ چکے تھے اپنے قوی ہاتھ پاؤں، چکلے ہاڑ اور رعب دار چہرے سے ہی جنگجو معلوم ہوتے ہیں اور ان کے مقابلے میں مرزا ترسون زادہ نرم گفتار، نرم رفتار، خوابیدہ سی آنکھیں اور بچوں کا سا معصوم چہرہ۔ سفرونوف دیو کے دیو آدمی، جتنے لمبے ہیں،

اتنے چوڑے ہیں، اتنے موٹے ہیں، پہلوانوں کی سی صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے اور شرارت بھری آنکھوں کو دیکھ کر گدگدانے کو جی چاہتا ہے۔ موسیٰ ایک اب دنیا سے رخصت ہو چکے صورت شکل سے کچھ مست قلندر معلوم ہوتے تھے، لمبے گھنگھریالے بال اور بہت بڑی بڑی سیاہ متحیّر آنکھیں۔ اس زمانے میں ہم نے جیسے سوویٹ یونین کی ایک خیالی تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی ویسے ہی وہاں کے عوام اور ادیبوں، دانشوروں کا بھی ایک خیالی پیکر گھڑ رکھا تھا۔ خیر ہم اتنے سادہ تو نہیں تھے جو یہ سمجھتے کہ ان لوگوں کے منہ سے شرارے جھڑتے ہوں گے یا ان کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوں گے لیکن یہ شبہ ضرور تھا کہ شاید یہ بہت ہی خشک سنجیدہ اور اپنے کو لئے دیئے رہنے والے لوگ ہوں گے جن سے ہنسی مذاق، ٹھٹھا مخول اور محض خوش گپی کچھ زیادہ مناسب نہ ہو۔ یہ مغالطے تو خیر پہلی ہی صحبت میں دور ہو گئے، لیکن پھر سوچا کہ یہ تو ادیب اور شاعر لوگ ہیں جو ہر جگہ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں وہاں کی عام مخلوق کبھی ملے تو ان کے مزاج کا صحیح اندازہ ہو۔ دو تین دن یہ مہمان ہمارے ہاں رہے، مزدور، کسان انجمنوں کی طرف سے چائے کی دعوت ہوئی، جس میں لائل پور کے ایک کسان طائفے نے دیہاتی رقص اور گیت پیش کئے۔ لاہور والی ایم سی اے ہال میں مشاعرہ ہوا جو مرزا ترسون زادے نے اپنی فارسی غزلیں سنا کر لوٹ لیا۔ برکت علی ہال میں تقریروں اور مقالوں کی نشست ہوئی۔ شہر کے تاریخی مقامات اور گلی محلوں کی سیر، دعوتیں، گپ، ان دو تین دن میں مغائرت کے باقی سب پردے بھی اٹھ گئے۔ یوں سوویٹ یونین کے نمائندوں سے ہمارا پہلا تعارف ہوا، اور اس کے ساتھ ہی حافظ کے الفاظ میں محبت کی وہ بنا پڑی جو خلل سے خالی ہے۔

سات برس اور گزر گئے۔ ۱۹۵۶ء میں دہلی سے مُلک راج آنند کا خط آیا کہ وہاں ایشیائی ادیبوں کی ایک کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں پاکستانی وفد کو شرکت کی دعوت ہے۔ ہمیں جیل خانے سے نکلے بہت دن نہیں گزرے تھے لیکن پرانی حکومت بدل چکی تھی اور نئی حکومت میں کچھ ہمارے کرم فرما بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ دہلی میں ہمارے ہائی کمشنر راجہ غضنفر علی خان مرحوم کی کوششوں سے دونوں ملکوں میں کشیدگی بھی کچھ کم ہو چکی تھی، چنانچہ ہمیں جانے کی اجازت مل گئی، وفد میں میرے

ساتھ مولانا عبدالمجید سالک مرحوم، قتیل شفائی اور اعجاز حسین بٹالوی شامل تھے۔ دلّی میں ان پرانے دوستوں کے علاوہ سوویت وفد کے کچھ نئے اراکین سے بھی ملاقات ہوئی جن میں وفد کی ترجمان ایک منحنی سی لڑکی مریم سلگانیک بھی شامل تھی۔ ان تین دن میں ان لوگوں سے خوش باشی کے علاوہ شرکت کار کا بھی موقعہ ملا کیونکہ اس تقریب میں بہت سے مسائل بحث طلب تھے۔ یہ ہم خیال لوگوں کی کانفرنس نہیں تھی، نہ اس میں ایک ہی طرز کی تنظیمیں شامل تھیں، اور سب سے زیادہ اختلافات خود ہندی مندوبین میں موجود تھے جنہوں نے کانفرنس طلب کی تھی، چنانچہ افتتاحی اجلاس تو خیریت سے گزر گیا لیکن اگلے دن جب PRE PARATORY یا انتظامات کی کمیٹی یکجا ہوئی تو کافی قصہ ہوا۔ ملک راج آنند اور سجاد ظہیر غالباً اسی ڈر سے کمیٹی کی صدارت میرے حوالے کر کے کھسک گئے۔ پروگرام کے بارے میں تو کوئی خاص جھگڑا نہیں ہوا، لیکن جب کانفرنس میں تجاویز پیش کرنے اور اس کے اختتام پر کوئی بیان جاری کرنے کا سوال آیا تو فوراً گرمی پیدا ہو گئی۔ ہندی ادیب اگے وتسائن اور ان کے کچھ ساتھیوں نے چھوٹتے ہی یہ موقف اختیار کیا کہ ہندی منتظمہ کمیٹی میں پہلے ہی طے پا چکا ہے کہ یہ کانفرنس محض ایک ہنگامی ایڈہاک قسم کی تقریب ہے جس میں صرف ادبی مسائل پر تقاریر ہوں گی اور مقالے پڑھے جائیں گے کوئی قرارداد پاس کرنے یا بیان جاری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض دوسرے ادیب جن میں سوویٹ وفد بھی شامل تھا اس پر مصر تھے کہ پہلی بار ایشیائی ادیب ایک کانفرنس میں یکجا ہوتے ہیں تو اس یکجائی سے کوئی مثبت نتائج برآمد ہونے چاہئیں۔ صرف ایک بار مل کر نشستند و گفتند و برخاستند تو کوئی بات نہ ہوئی۔ اب اگر یہ سلسلہ شروع ہوا ہے تو اسے جاری رکھنے کی کوئی صورت ہونی چاہیئے بلکہ اس کا دائرہ وسیع کر کے اس میں افریقی ادیبوں کو بھی شامل کرنا چاہیئے۔ پہلا فریق کہہ رہا تھا کہ اگر اس طرح کانفرنس کو کسی مستقل تنظیم کی شکل دی گئی تو یہ ان سے سمجھوتے کی خلاف ورزی ہو گی اور ان کے سب ہم خیال کانفرنس سے واک آوٹ کر جائیں گے۔ جب اتفاق رائے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میری تجویز پر اجلاس کچھ دیر کے لئے ملتوی کر دیا گیا اور پھر دو چار لوگوں نے بیٹھ کر مفاہمت کا یہ فارمولا مرتب کیا کہ اس کانفرنس میں کسی مستقل تنظیم کی تجویز پیش نہ کی جائے صرف ایک اور کانفرنس کے لئے سوویٹ

یونین کی دعوت قبول کر لی جائے اور یہ مسئلہ اس دوسری کانفرنس پر چھوڑ دیا جائے۔ کانفرنس کی جانب سے کوئی بیان بھی جاری نہ کیا جائے البتہ مختلف مسائل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جائے ان کا خلاصہ چھاپ دیا جائے۔ یوں اگلی کانفرنس تاشقند میں منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا اور اس طرح دو سال بعد آخر کار ہمیں سوویٹ سرزمین پر قدم رکھنے کا موقع ہاتھ آیا۔

تاشقند

اکتوبر ۱۹۵۸ء کا مہینہ تھا، کچھ ردوکد کے بعد پاکستان سے صرف دو آدمیوں کو تاشقند جانے کی اجازت ملی۔ ایک ابوالاثر حفیظ جالندھری صاحب اور ایک میں۔ ہم شام کے وقت تاشقند پہنچے اور نو تعمیر تاشقند ہوٹل میں ٹھہرائے گئے جو غالباً اسی کانفرنس کے لئے تعمیر کیا گیا تھا اور ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ایک پکے فرش کا کھلا میدان ہے، درمیان میں ہماری مغلئی طرز کا فوارہ اور دوسری جانب نوائی تھیٹر کی عالی شان عمارت ہے جس میں اگلے دن کانفرنس کا افتتاح ہوتا تھا۔ تھیٹر میں بڑے ہال کے علاوہ اور بہت سے کمرے ہیں جو مختلف جمہوریتوں کی اپنی اپنی طرز پر سجائے گئے ہیں۔ کھانے کی میز پر معلوم ہوا کہ دہلی کانفرنس کی طرح یہاں بھی انتظامات کی کمیٹی میں ایجنڈے پر جھگڑا ہے جو تین چار دن سے چل رہا ہے۔ کھانے کے بعد رات کے نو بجے کمیٹی کا اجلاس تھا، مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی۔ ازبکستان کے ممتاز ادیب شرف رشیدوف جو اس زمانے میں جمہوریہ کے وزیر اعظم بھی تھے اور اب وہاں کی پارٹی کے اوّل سیکرٹری ہیں صدارت کر رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے قائدین کو ایک قرارداد کے کچھ الفاظ اور جملوں پر اعتراض تھا۔ کافی دیر بحث چلی اور آخر کچھ کہنے سننے کے بعد انہوں نے اعتراض واپس لے لیا، قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور اس ایک ہی نشست میں ہمیں کچھ اور دوست بھی ہاتھ آ گئے۔ صبح کانفرنس میں جانے لگے تو سامنے کے میدان میں ایک جم غفیر جمع تھا۔ ازبک عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے۔ ان میں اکثریت تو طلبہ اور طالبات کی تھی لیکن مزدور، کسان، دفتری کارکن، پنشنر، سبھی طرح کے لوگ موجود تھے۔ تالیاں، مصافحے، السلام علیکم، زندہ باد۔ سوویت عوام سے

یہ ہمارا پہلا تعارف تھا۔

دو دن تو ہوٹل اور نوائی تھیٹر کے علاوہ ہم کچھ دیکھ نہ سکے، صرف رات کو ازبکستان کی جدید موسیقی رقص اور ڈرامے کے کمالات دیکھنے میں آئے جن میں قدیم وجدید کا بہت باسلیقہ اور خوش ذوق امتزاج تھا۔ انہیں محفلوں میں ان بہت سے نامور ادیبوں اور دانشوروں سے جن سے کانفرنس میں محض علیک سلیک ہوئی تھی زیادہ قریبی مراسم کا لطف حاصل ہوا۔ سوویت ادیبوں میں پرانے آشناؤں کے علاوہ اور بہت سے لوگوں سے ملنا ہوا۔ روس کے کانسٹانتن سمونوف، الیکسی سرکوف، قازقستان کے مختار اویزوف، اور کوبانف، گرجستان کے اراکلی اباشدزے، ترکمانستان کے کاراسطلی، آرمینیا کے فرزتاجکستان کے میر شکر، ازبکستان کے شرف رشیدوف کے علاوہ ڈاکٹر عظیموف (جو اب پاکستان میں سوویٹ سفیر ہیں) زلفیہ خانم اور ایک اردو زبان کے نوجوان شیدائی محمد تیمی جان جو اردو غزل اس عمدہ لحن سے پڑھتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔ تیسرے دن کانفرنس سے ذرا فرصت ہوئی تو ہم شہر کی سیر کو نکلے۔ جب کا تاشقند آج کل کا تاشقند نہیں تھا، دو چار جدید محلّوں کو چھوڑ کر باقی شہر اپنی پرانی وضع پر قائم تھا۔ اس نئے علاقے میں بھی بیشتر عمارتیں حکومت کے یا پبلک اور رفاہی اداروں کے دفاتر تھے یا ہوٹل اور قہوہ خانے تھے۔ رہنے کے گھر بہت کم تھے، بیشتر لوگ ابھی تک پرانے محلّوں میں باہر سے کچّے اور اندر سے پکّے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض کافی وسیع اور شاندار گھر بھی تھے جیسے موسی ایبک کا گھر تھا یا زلفیہ خانم کا گھر تھا لیکن ان کا نقشہ بھی وہی پرانا نقشہ تھا، ایک پھل پھول کا باغیچہ، کشادہ برآمدہ، بیٹھک یا دیوان خانہ، دالان اور سونے کے دو کمرے۔ جب ہم شہر کی منڈی میں پہنچے جسے بازار کہتے ہیں تو یوں لگا جیسے اس صدی اور اس ماحول سے پھلانگ کر کسی اور زمانے اور کسی اور دنیا میں پہنچ گئے ہیں جن کا ذکر بچپن اور نوجوانی میں پڑھا تھا اور جو لوگ سامنے چل پھر رہے ہیں ان ہی کتابوں میں سے اٹھ کر چلے آرہے ہیں کوئی الف لیلیٰ میں سے، کوئی حاجی بابا سے، کوئی ملّا ناصر الدین سے۔ ان بڑے میاں کو دیکھو جو گدھے پر سوار جا رہے ہیں، سر پر گول سفید عمامہ، بدن پر ریشمی، روئی کی مرزئی، گھٹنوں تک لمبے بوٹ، سرخی مائل گندمی رنگ، لانبی مغلئی آنکھیں، ٹھوڑی تک ڈھلکی ہوئی مونچھیں اور چھدری نوکدار ڈاڑھی یا اس بڑی بی کو دیکھو

تنگ موری کا سیاہ پاجامہ، اسی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا، سر پر سرخ رنگ کا رومال بندھا ہے اسی پر برائے نام نقاب کا بالائی حصہ بھی اوڑھ رکھا ہے اگرچہ منہ کھلا ہے۔ بازار میں خریدنے اور بیچنے والوں کے ٹھٹ لگے ہیں، تازہ پھل، خشک میوے، ترکاریاں، شہد، گوشت، پھول، سودا سلف کے لئے خوانچے ور چھابڑیاں لگی ہیں۔ استعمال کی اشیا یعنی برتن، کپڑے، صابن تیل کے لیے پکی دکانیں ہیں، دکانیں امدادِ باہمی کی ہیں، کھانے پینے کا مال بیشتر بیچنے والوں کا اپنا ہے۔ اس سے ذرا آگے چلو تو کوئی چائے خانہ ملے گا، تختوں پر بیٹھے بوڑھے بیشتر قہوہ پی رہے ہیں، شطرنج کھیل رہے ہیں، گپ لڑا رہے ہیں یا لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ یہاں سے ہٹ کر شہر کے ایک دوسرے حصے میں جاؤ تو نظر کے پردۂ فلم پر بالکل دوسرا منظر دکھائی دے گا۔ کوٹ پتلون میں ملبوس صاف ستھرے، ذہین چہروں والے نوجوان، خوش شکل، نازک اندام لڑکیاں، سر پر کڑھی ہوئی کلاہ کج کیے، ٹخنوں سے نیچے تک سیاہ اور فیروزی یا نسواری زرد اور سرخ لہریا، اطلس کی قبائیں پہنے بغل میں کتابیں تھامے تیز تیز قدموں سے اپنی یونیورسٹی، انسٹی ٹیوٹ یا تجربہ گاہ کی جانب رواں ہیں۔ لیکن بازار ہو یا دو رویہ سایہ دار چناروں والی یونیورسٹی کی سڑک بہت سے راہگیر آپ کو دیکھ کر ضرور ٹھٹھکیں گے "السلام علیکم" "آپ کہاں سے آتے ہیں" اور جو آپ نے کہہ دیا کہ پاکستان سے تو پانچ سات منٹ تک سوال جواب ضرور ہوں گے۔

شہر سے چند میل دور ہم ایک اشتمالی فارم دیکھنے پہنچے جسے کولخوذ کہتے ہیں۔ مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے کولخوذ ہیں کوئی زرعی فارم ہے، کوئی پولٹری فارم ہے، ڈیری فارم ہے، بھیڑیں پالنے کا فارم ہے، کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ بعد میں ان میں سے کئی ایک میں جانے کا اتفاق ہوا لیکن یہ پہلا فارم تھا جو ہم نے دیکھا اور بعد میں جہاں جہاں بھی گئے سب میں بنیادی نظام قریب قریب ایک ہی جیسا پایا۔ یہ بہت بڑا زرعی فارم ہے جس میں روئی، گندم، اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کولخوذ کے سربراہ ایک لمبے تڑنگے، بہت ہی رعب دار رتیبانہ صورت کے ازبک بزرگ حمزہ قل صاحب تھے جو دیکھنے میں کسی فلم کے انقلابی جرنیل معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں کولخوذ کا پورا نظام سمجھایا گیا۔ سال میں کتنی یافت ہوتی ہے، کتنا حصہ ترقیاتی اور رفاہی کاموں کے لئے یعنی سڑکوں، ہسپتال، اسکول، تفریح گاہوں

کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے، کتنی رقم بیواؤں، یتیموں یا معذور لوگوں کی امداد کے لئے، حکومت سے کیا لین دین ہوتا ہے۔ آمدنی ممبروں میں کس حساب سے تقسیم ہوتی ہے (کام کا ایک "ورک یونٹ" مقرر ہے، جو آدمی جتنے یونٹ کام کرے، اس کے مطابق اسے حصہ ملتا ہے، ظاہر ہے کہ کولخوز کی آمدنی میں جتنا اضافہ ہوگا اور کوئی شخص جتنے یونٹ کام کرے گا اسی کے مطابق اس کی ذاتی آمدنی بھی بڑھے گی۔) فارم کے عہدہ داروں کا انتخاب کیسے کیا جاتا ہے، فارم کے کاروبار کی اصلاح کے لئے بحث و تنقید کی کیا صورت ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر فارم کا ٹریکٹر اسٹیشن دیکھا، ورکشاپ دیکھا، کارکنوں کے گھر دیکھے اور ان سے ملحقہ قطعۂ زمین بھی جو ان کی ذاتی ملکیت سمجھا جاتا ہے، بہت سے پکے یا لکڑی کے گھر بن چکے تھے، کچھ ابھی کچے تھے جن کی تعمیر سالِ رواں کے منصوبے میں شامل تھی۔ ہم ایک کچے گھر کے قریب پہنچے تو حفیظ صاحب اچانک اچھل پڑے، "ارے وہ دیکھو، وہ دیکھو" میں نے کہا کیا ہے؟" بولے "اپلے، وہ دیکھو دیوار پر اپلے، بالکل اپنے جیسا ہے کہ نہیں ہے؟" میں نے کہا "ہاں! یہ بات تو اپنے جیسی ہے لیکن باقی سب کچھ اپنے جیسا معلوم نہیں ہوتا۔"

سب کچھ دیکھ کر ہم فارم کے کلب گھر میں پہنچے جہاں کھانے کا انتظام تھا، ازبک کھانوں میں بیشتر تو وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ شوربہ، پلاؤ، نان، کباب، دہی، سلاد وغیرہ لیکن طرح طرح کے سالن نہیں ہوتے جو ہمارے ہاں پکتے ہیں نہ مرچ مصالحے میں ہم جیسے تکلفات پائے جاتے ہیں، البتہ ایک چیز میں نے یہاں پر نئی دیکھی۔ یہ لوگ شیشے کے مخصوص برتنوں میں پھل اسی طرح سجاتے جاتے ہیں جیسے گلدانوں میں پھول سجائے جاتے ہیں، گلابی رنگ کی خوبانیاں، سیپی کے رنگ کے سیب، اودے اور سنہری انگوروں کے گچھے، بالکل کسی مصوّر کی بنائی ہوئی اسٹل لائف تصویر معلوم ہوتی ہے۔

میں نے تاشقند کے کچے گھروں کا ذکر کیا تھا جو باہر سے بہت بوسیدہ معلوم ہوتے ہیں، اگلے دن پتہ چلا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ہم کسی ضیافت سے گھر کی طرف لوٹ رہے تھے کہ حفیظ صاحب نے کہا کہ بھئی اب تک تو ہم نے وہی کچھ دیکھا ہے جو ان لوگوں نے دکھایا ہے، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بغیر اطلاع کے خود کوئی گھر دیکھ سکیں؟" میں نے کہا پوچھ لیتے ہیں، میں نے اپنے مترجم دلیری سے پوچھا یہ جو گھر سامنے

نظر آرہا ہے اس میں جا سکتے ہیں ہم نے کہا کیوں نہیں جا سکتے۔ ہم نے دروازے پر دستک دی، ایک بزرگ صورت حضرت نکلے، ولیری نے ہمارا تعارف کروایا، بہت گرمجوشی سے ملے اور ہمیں اندر لے گئے۔ اندر جا کر پتہ چلا کہ گھر کے ظاہر و باطن میں کتنا فرق ہے۔ گھر کے اندر قیمتی قالین، ظرف ظروف اور بہت پرتکلف سازوسامان موجود تھا ہم دالان میں قالین پر بیٹھ گئے ان پرانے گھروں میں کرسی میز کا رواج نہیں ہے۔ دالان کو دیکھ کر آج سے چالیس برس پہلے کے اپنے پرانے گھروں کے زنان خانے کی یاد آئی۔ ایک طرف نیچے سے اوپر تک الماریوں میں برتن سجے ہیں، دوسری طرف مہمانوں کے لئے بستروں کا ڈھیر ہے، دیوار پر قرآنی آیات کے کتبے ہیں اور صاحب خانہ اور ان کی بیگم کی جوانی کے زمانے کی تصویریں۔ ہم بیٹھے ہی تھے کہ گھر کی بیگم نے قہوہ پیش کیا، یہاں کا دستور یہی ہے کہ وقت بے وقت جب بھی کسی گھر جاؤ قہوہ فوراً تیار ملے گا۔ غالباً سماوار ہر وقت چڑھی رہتی ہے۔ پھر خاتون خانہ نے اور بہت سی چیزیں ہمارے سامنے چن دیں، مربے، پھل، روٹی، پنیر وغیرہ اور کھانے پر اصرار کیا۔ ہم نے بہت کہا کہ ہم ابھی ابھی ایک ضیافت سے سیر ہو کر آئے ہیں لیکن وہ نہیں مانیں اور ہمیں کچھ کھانا ہی پڑا۔ کھانے پلانے میں تو خیر یورپی روس کے لوگ بھی کافی تکلف برتتے ہیں لیکن ان مشرقی علاقوں میں تو بے حد تکلف ہے۔ جارجیا ہے، آذربائیجان ہے، ازبکستان ہے، قازقستان یا داغستان ہے۔ یہاں کے لوگ تو گویا اس تاک میں رہتے ہیں کہ کوئی مہمان ہاتھ لگے اور اسے کھلا پلا کر دنیہ بنا ڈالیں۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ہمارے میزبان فوجی افسر تھے۔ اب ریٹائر ہو چکے ہیں، ایک بچی ڈاکٹر ہے، ایک لڑکا انجینئر ہے، وہ بھی ساتھ رہتے ہیں، پینشن بھی آتی ہے، گھر کے صحن میں انگور اور ناشپاتی کا باغیچہ ہے، اس سے بھی کچھ مل رہا ہے۔ غرض کہ آسائش سے بسر کرتے ہیں۔

۱۹۵۸ء کے بعد میں نے تاشقند دو بار پھر دیکھا ہے۔ پہلی بار ۱۹۶۷ء کے تباہ کن زلزلے سے تھوڑے ہی عرصے بعد اور دوسری بار اب سے کوئی دو برس پہلے۔ پہلی بار تاشقند روانہ ہونے سے قبل ہم ماسکو میں شہر کی تباہی کے دلخراش قصے سن چکے تھے اور ماسکو میں امدادی فنڈ جمع کرنے کے لئے جگہ جگہ تقریبات ہو رہی تھیں، فٹ بال میچ، موسیقی کی محفلیں، ماسکو اسٹیڈیم میں جہاں کوئی بیس پچیس ہزار تماشائیوں کی گنجائش

ہے، مشہور شاعر پوتو شنکو کو سننے کے لئے خلقت امڈی آرہی تھی۔ داخلے پر بہت بھاری ٹکٹ لگایا گیا تھا لیکن جب ہم اندر پہنچے تو کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ تاشقند پہنچے تو شہر کا عجب نقشہ دیکھا، تاشقند ہوٹل جس میں ہم ٹھہرے تھے اور اس کے آس پاس کے علاقے کو تو کوئی خاص گزند نہ پہنچا تھا لیکن پرانے شہر کا بیشتر حصہ زمیں بوس ہو چکا تھا۔ سینکڑوں بل ڈوزر ملبہ صاف کرنے میں لگے تھے اور بیشمار کرین نئی بنیادوں پر نئی بنائی دیواریں جمارہے تھے جن میں محنت کشوں کا لشکر دروازے اور کھڑکیاں جوڑنے میں مصروف تھا، ہر سوویٹ جمہوریہ کے رضا کار شہر کی تعمیرِ نو میں حصہ لینے آتے تھے۔ ایک جمہوریہ نے ایک محلّہ اپنے ذمّے لے رکھا تھا تو دوسری نے دوسرا۔ ابھی تک بہت سے لوگ خیموں میں پناہ گزیں تھے لیکن زندگی کا کاروبار حسب معمول چل رہا تھا۔ اسکول اور کالج کھلے تھے، دفتروں اور کارخانوں میں کام جاری تھا۔ بہت سے لوگ دکھی تو ضرور تھے لیکن شاکی نہیں تھے۔ پھر اب سے دو برس پہلے جب ہم ازبک انجمن مصنفین کی دعوت پر تاشقند پہنچے تو ایک بالکل نیا شہر آباد نظر آیا۔ پہلے شہر میں صرف ایک یا دو ہی کشادہ دو طرفہ سڑکیں تھیں اب کئی ایک ہیں اور پرانے گلی کوچے بہت کم رہ گئے ہیں۔ یک منزلہ مکانوں کے بجائے کئی منزلہ فلیٹ بن گئے ہیں، جدید طرز کے اسٹور ہیں، پارک ہیں، فوارے ہیں، بجلی کے آرائشی کھمبے ہیں۔ اس طرح کا اور بہت کچھ ہے لیکن وہ پرانے بازار اور چائے خانے اب بھی باقی ہیں اور شہر کا اپنا کردار بھی۔

گزشتہ دس برس میں اس جمہوریہ کے جملہ شعبوں کی کارگزاری کا حال ہم نے شرف رشید صاحب کی زبانی ان کے دفتر میں سنا۔ انہوں نے بتایا کہ روئی کی پیداوار میں اب ازبک جمہوریہ کا دنیا میں پہلا نمبر ہے اور اس نے امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے، قدرتی گیس کے اتنے وسیع ذخائر دریافت ہوتے ہیں کہ ازبکستان کی پوری سرزمین گیس کے سمندر پر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اتنے ہزار کلومیٹر نئی سڑکیں بنی ہیں اتنے لاکھ کلوواٹ مزید بجلی پیدا ہوتی ہے، اتنے نئے کارخانے کھلے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں کہا لیکن مجھے تاسف ہے کہ ہمارے ادب اور ثقافت نے اسی رفتار سے ترقی نہیں کی۔ ان اعداد و شمار کے مقابلے میں جو میں نے ابھی گنوائے ہیں ذرا ان حضرات سے پوچھو کہ قابلِ ذکر کتابیں کتنی تصنیف ہوتی ہیں جو ہمارے

میزبان ادیبوں کا منہ کچھ لٹکا ہوا دیکھ تو میں نے کہا جناب عالی! آپ سڑکیں اور کارخانے اور بجلی گھر تو اپنے منصوبوں کے مطابق تیار کر سکتے ہیں لیکن فن و ادب کی منصوبہ بندی کا ڈھب ابھی تک دنیا نے نہیں سیکھا، اگر گزشتہ دس سال میں آپ کے کسی شاعر نے ایک بھی یادگار شعر کہا ہے تو غنیمت جانیئے ہمارے سب ادیب دوست خوش ہو گئے۔

سمر قند و بخارا

تاشقند کانفرنس کے بعد ہمیں دو تین اور جگہ کے لئے دعوت تھی لیکن ہم میں سے چند ایک نے درخواست کی کہ اتنی دور آئے ہیں تو ہمیں سمرقند و بخارا کی بھی ایک جھلک دکھلا دیجیے۔ پروگرام تو پہلے سے بن چکا تھا لیکن ہمارے اصرار پر دن بھر کے لئے سمرقند اور بخارا کی سیر بھی اس میں شامل کر لی گئی۔

صبح منہ اندھیرے ہمارا چھوٹا طیارہ سمرقند کے ہوائی اڈے پر اترا۔ گردش افراسیاب کی گرد آلود سڑک کے دونوں جانب ویران چٹیل میدان، دھیرے دھیرے اجالا پھیل رہا تھا اور پھر دور افق پر سمرقند کے گنبد و مینار دھند سے یوں ابھرے جیسے یکایک دل میں کوئی خوبصورت شعر یا حسین خیال وارد ہوتا ہے۔ گور امیر یعنی امیر تیمور کا مقبرہ، جامع مسجد کا سرنگوں گنبد، مدرسہ الغ بیگ کی محرابیں، روشنی پھیلتی گئی ہم قریب آتے گئے اور فلم کے سلوموشن کی طرح ان عمارتوں کے دیوار و بام، نقش و نگار اجاگر ہوتے گئے۔ جب شہر میں کوئی ٹھکانے کا ہوٹل نہیں تھا، شہر کے باہر ایک بہت سرسبز باغ میں ایک مہمان خانے یا ریسٹ ہاؤس میں ناشتہ چنا رکھا تھا، مقامی میزبان جن میں شہر کی انتظامیہ کے صدر، مقامی کولخوز کے سربراہ، قالین کھالوں کے کارخانے کے مینیجر، اور کچھ مقامی ادیب اور دانشور شامل تھے پذیرائی کو موجود تھے۔ ناشتے پر اور راستے میں چلتے ہوئے شہر کی قدیم تاریخ اور جدید ترقی کی روداد سنتے رہے لیکن ان دنوں قدیم تاریخ یا پرانے آثار پر اتنی توجہ نہیں تھی۔ سارا زور اس علاقے کی زرعی، صنعتی، رفاہی اور مادی ترقی پر دیا جا رہا تھا۔ قدیم عمارتوں کی دیکھ بھال تو ہو رہی تھی لیکن گورِ امیر، شاہِ زندہ کی زیارت گاہ، جامع مسجد اور اس سے ملحقہ عالیشان مدرسے سب ایک

جیسی حالت میں نہ تھے، کہیں فرش اکھڑا ہوا ہے، کہیں چھت کے نقش و نگار معدوم ہو چکے ہیں یا دیواروں میں رخنہ آ گیا ہے، پھر بھی ان آثار کے حسن و شکوہ میں فرق نہ آیا تھا، اور اس شہر کی عظمتِ دیرینہ کا تصور کچھ مشکل نہ تھا، بخارا کی حالت ان دنوں کچھ زیادہ خستہ تھی۔

بخارا کی قدیم عمارتیں مٹیالے رنگ کے پتھر یا اینٹ کی ہیں جن پر سمرقند جیسا کاشی کاری کا رنگین کام بہت کم ہے۔ لیکن اس سطحی آرائش و زیبائش کی غیر موجودگی میں ان عمارات کے خم و خط کی شائستگی، ان کے در و بام کا تناسب اور ان کے بنیادی ڈیزائن کی خوبیاں اور بھی نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں آیات اور کتبے کندہ کرنے کے لئے رنگین ٹائلوں اور پچی کاری کے بجائے سنگ تراشی اور منبت کاری سے کام لیا گیا ہے جو کچھ کچھ ٹھٹھ کے مکلی کے مزاروں سے مشابہ ہے۔ اس پہلی اور سرسری نظر میں مجھے یوں لگا کہ بخارا اور سمرقند کے فن تعمیرات میں کچھ ویسا ہی فرق ہے جو ہمارے ہاں تغلق اور لودھی عہد کی عمارتوں اور جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانے کی عمارات میں ہے۔

لیکن جیسا اوپر بیان ہوا ان دنوں قدیم آثار پر زیادہ توجہ نہیں تھی البتہ سمرقند اس وقت بھی کافی اہم صنعتی مرکز بن چکا تھا۔ ریشم، اون، پارچہ بافی، قالین سازی اور کیمیائی اشیاء کے کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ بہت سی نئی عمارتیں بھی بن چکی تھیں اور شہر میں کافی چہل پہل تھی۔ البتہ بخارا اس کے مقابلے کچھ کم حیثیت قصبہ معلوم ہوتا تھا۔ اب سے دو تین برس پہلے دوبارہ ادھر آنا ہوا تو حالات مختلف تھے۔ اب قدیم تاریخی عمارتوں کی مرمت اور بحالی کو ایک سائنس یا فن کا رتبہ مل چکا ہے، سمرقند کی جامع مسجد اور مدرسہ الغ بیگ کے حجروں میں اس شعبے کی ایک باقاعدہ اکادمی قائم ہے جس میں مختلف ایشیائی جمہوریتوں کے طلبہ تربیت کے لئے آتے ہیں اور ان تاریخی شہروں کے خدوخال نکھارنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے نام کسی زمانے میں بہت معزز و محترم تھے۔ خیوا، خجند، مرو، ترمذ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ سمرقند میں گور امیر اور شاہ زندہ کی مرمت اور بحالی قریب قریب مکمل ہو چکی تھی۔ بالائے کوہ الغ بیگ کی نادر روزگار رسدگاہ جو ہمارے پہلے سفر کے وقت محض کھنڈروں کا ڈھیر تھی اپنی اصلی صورت پر آ چکی تھی۔ جامع مسجد اور مدرسوں کی مرمت کا کام جاری تھا اگرچہ میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مسجد کا مرکزی گنبد جو چھت بیٹھ جانے کی

وجہ سے نیچے گر چکا ہے دوبارہ کیسے اٹھایا جائے گا، لیکن غالباً یہ بھی ہو ہی رہے گا۔ اگر چاند پر راکٹ اتارا جاسکتا ہے تو ایک چھت پر گنبد کیوں نہیں رکھا جاسکتا۔

آثارِ قدیمہ کے بارے میں یہ صورت حال سمرقند اور بخارا سے مخصوص نہیں ہے، یورپی روس میں بھی اسی طرح حال کو سدھارنے کی فکر پہلے کی گئی، ماضی کو سنوارنے کی باری بعد میں آئی اور میرے خیال میں ہونا بھی یونہی چاہیئے۔ جو فرد یا قوم اپنے حال سے بے فکر و مطمئن اور روزمرہ زندگی کے تقاضوں سے فارغ الخاطر ہو اسے ماضی سے عشق کرنے کی فرصت یا دماغ کہاں میسّر آتا ہے۔ اپنے حال سے غیر مطمئن لوگ جذباتی طور سے ماضی کے خواب ضرور دیکھتے ہیں اور پدرم سلطان بود کی رٹ بھی ضرور لگاتے رہتے ہیں لیکن اس ماضی کو حال سے منطبق کرنے، اس کی صحیح بصیرت حاصل کرنے اور اپنے ہاتھ سے اس کی نوک پلک سنوارنے کی سکت انہیں لوگوں میں پائی جاتی ہے جو اپنے حال سے عہدہ برآ ہو چکے ہوں۔

دوشنبہ سے ماسکو تک

سمرقند اور بخارا تو صدیوں سے بستے، اجڑتے اور پھر بستے چلے آتے ہیں لیکن دوشنبہ نام کا کوئی شہر انقلاب سے پہلے کہیں موجود نہیں تھا۔ وسطِ ایشیا کی بعض اور جمہوریتوں کے نئے شہری مراکز مثلاً الما آتا یا جہاج قلعہ کی طرح دوشنبہ بھی انقلاب کے بعد کی پیدائش ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جسے دوشنبہ اس لئے پکارتے تھے کہ یہاں دوشنبہ کے دن منڈی لگتی تھی۔ اب یہ جمہوریہ تاجکستان کا دارالحکومت ہے۔ اسی سبب سے یہاں کی سڑکیں، عمارتیں، مکانات سب جدید طرز کے ہیں۔ گرچہ انہیں بھی کچھ مقامی انفرادی رنگ دینے کی کوشش ضرور کی گئی ہے۔

دوشنبہ میں رودکی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب منائی جا رہی تھی اور اسی سلسلے میں ہمیں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یوں تو ہمیں تاشقند و سمرقند الما آتا یا اشک آباد، یا جہاج قلعہ کہیں بھی اجنبیت کا زیادہ احساس نہیں ہوتا اس لئے کہ اخلاق و آداب، رہنے سہنے، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں یہاں کے سب لوگ اپنے ہی بھائی بند معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تاجکستان میں ان سب باتوں پر مستزاد یہ ہے

کہ مترجم کی ضرورت نہیں پڑتی اور سب سے براہِ راست بات چیت ہو سکتی ہے۔ تاجکستان کی زبان فارسی ہے اور وہ بھی ایرانیوں والی فارسی نہیں ہماری والی فارسی۔ لیکن یہاں کے لوگ اسے فارسی نہیں کہتے تاجکی کہتے ہیں۔ یہ جائز اور صحیح بھی ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ آج کل کی ایرانی زبان کو بھی فارسی نہیں ایرانی کہنا چاہیے، کیونکہ اس کی موجودہ لغت و رلب ولہجہ اس زبان سے بہت مختلف ہے جو کسی زمانے میں وسط ایشیا کی مشترکہ علمی اور ادبی زبان تھی، تاجکستان میں یہی پرانی زبان رائج ہے۔

جشن رودکی بہت دھوم دھام سے منایا گیا۔ شاہراہوں پر جگہ جگہ رودکی کی تصویریں اور اشعار کے کتبے آویزاں تھے۔ شہر کی صدر لائبریری میں رودکی سے متعلق کتابوں اور مخطوطات کی نمائش لگی تھی اور ہمیں یہ دیکھ کر خاص خوشی ہوئی کہ ان کتب میں مولانا شبلی نعمانی کی شعر العجم کو سب سے ممتاز مقام حاصل ہے۔ پہلی رات "بوئے جوئے مولیاں آید ہمے" کی مشہور غزل اور اس غزل سے جو قصّہ منسوب ہے بہت ہی زرق برق ساز و سامان کے ساتھ ایک بیلے یا رقص و نغمہ کی صورت میں پیش کیا گیا، دوسری رات حیاتِ رودکی کے بارے میں ہمارے عزیز دوست میر علی میر شکر کا لکھا ہوا ڈرامہ اسٹیج کیا گیا جس کے چند سین اتنے سال گزر جانے کے بعد اب بھی دل پر نقش ہیں۔ خاص طور سے وہ سین جب بادشاہ کے حکم سے رودکی کی آنکھیں نکالی جاتی ہیں اور وہ چلّا کر کہتا ہے "ربا چشمانِ مرار بودند، چشمِ دل مابکشا"۔ دن میں میر شکر کے ہاں ان کی بیگم کی شیریں آواز میں میر شکر کی غزلیں سنیں، مرزا ترسون زادہ سے علامہ اقبال کے فکر و سخن پر گفتگو ہوئی۔ علامہ اقبال کا فارسی کلام جتنا یہاں کے لوگوں کو حفظ ہے ہمارے ہاں شاید ہی کسی کو یاد ہو۔ یونیورسٹی دیکھی، بچوں کے مدارس دیکھے اور وہ جو سنا تھا کہ انقلاب سے پہلے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں منڈی لگا کرتی تھی اس گاؤں کا تصور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جب ہم شہر کا میڈیکل کالج اور مرکزی ہسپتال دیکھنے پہنچے تو کالج کے پرنسپل اور ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر صاحب کی زبانی (جن کا نام ذہن سے اتر گیا ہے) اس گاؤں کی کچھ کیفیت سننے میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا جب ہم بچے تھے تو یہ جگہ جہاں تم بیٹھے ہو سنسان بیابان تھا جہاں ہم گیدڑ کا شکار کھیلنے آیا کرتے تھے۔ آس پاس کوئی اسکول نہیں تھا۔ گاؤں کی مسجد میں ملّا صاحب نے جو کچھ پڑھا دیا اور جتنا پڑھا دیا وہی گاؤں والوں کا مبلغ علم تھا۔ ڈاکٹر

حکیم، یا ہسپتال کا تو کیا ذکر ہے البتہ ایک دندان ساز یا دندان شکن حضرت ضرور موجود تھے جن کے پاس دانت کے درد کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جسے بھی یہ شکایت ہوتی وہ آگ پر ایک کیل سرخ کر کے اور پھر اسے مروڑ کر دانت نکال دیا کرتے تھے۔ اب اس ہسپتال سے ہر سال تین سو لڑکے اور لڑکیاں ڈاکٹری کی ڈگری لے کر نکلتے ہیں۔

دو شنبہ کے بعد ہمیں طفلس جانے کی دعوت تھی۔ شام کے وقت طیارہ باکو شہر کے قریب پہنچا تو اطلاع ملی کہ راستے میں موسم اچھا نہیں ہے۔ یہیں پر اتر جانا چاہیئے۔ یہاں ہمارے آنے کی کسی کو اطلاع نہیں تھی۔ ایئرپورٹ سے ادیبوں کی مقامی انجمن کو ٹیلی فون پر کہا گیا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہم لوگ باکو رک گئے ہیں۔ رات کو یہیں قیام ہوگا اس لئے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کیا جائے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبی چوڑی سیاہ موٹر کار ایئرپورٹ ریسٹورنٹ کے سامنے آ کر رکی اور مہدی صاحب برآمد ہوئے جو آذربائیجان ادیبوں کی انجمن کے صدر ہیں۔ بہت تپاک سے ملے اور کہا کہ جانے موسم کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ ایروفلوٹ کا کو رات بھر کے لئے ہمیں بھی آپ کی میزبانی کی مسرت حاصل ہوئی۔ میری حکومت آپ کا تہ دل سے خیر مقدم کرتی ہے۔ اور آپ کی تشریف آوری کے لئے شکرگزار ہے۔ لیکن آپ کل کیوں جانا چاہتے ہیں کچھ دن ہمارے پاس بھی ٹھہریئے۔ حکومت کے سرکاری مہمان خانے میں آپ کے لئے سب اہتمام موجود ہے۔ میری حکومت کو افسوس ہے کہ ہمیں آپ کی آمد کی اطلاع نہیں تھی اس لئے آپ کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں کر سکے اور اگر آپ کی مدارات میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کے لئے میری حکومت پیشگی عذر خواہ ہے۔" مہمان خانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہ میرا غریب خانہ ہے، آپ کا جی چاہے تو یہیں تشریف رکھیں، میری عزت افزائی ہوگی لیکن میرے خیال میں مہمان خانہ زیادہ آرام دہ ہے۔" ہم مہمان خانے کی عالیشان عمارت میں داخل ہو چکے تو میں نے ولیری سے پوچھا یہ صاحب میری حکومت، میری حکومت کیا کہہ رہے ہیں۔" ولیری نے جواب میں کہا "انہیں نہیں جانتے یہ یہ صاحب آذربائیجان جمہوریہ کے صدر ہیں۔ شاعر بھی ہیں، افسانہ نویس اور یہاں کی ادبی انجمن کے صدر بھی۔ ساتھ میں کوئی سن رہا تھا، شاید عبدالحئی تاباں تھے، بولے "بھئی عجیب بات ہے ابھی ایک وزیر اعظم ادیب صاحب

سے رخصت ہو کر آرہے ہیں، اب یہ صدر نکل آتے، یہاں کے ادیبوں کو حکومت کرنے کے سوا کام نہیں یا پارٹی کو ادیبوں کے سوا حکومت کرنے کے لئے کوئی اور نہیں ملتا۔" یہ بعد میں کھلا کہ ادیبوں پر موقوف نہیں یہاں حکومت کے کاروبار میں معلم، سائنسداں، اداکار، فلم ساز، موسیقار، ہر کسی کو صلاحیت اور کارگزاری کے مطابق حصہ ملتا ہے اس لئے کہ یہاں سیاست معاشرے کے دوسرے معمولات سے الگ تھلگ کوئی شعبہ نہیں ہے نہ اس پر کسی مخصوص طبقے کا اجارہ ہے۔

اگلے دن ہم کوہ قاف میں تھے یعنی گرجستان کے دارالحکومت تبلیسی یا طفلس میں جسے غالباً دنیا کے حسین ترین شہروں میں شمار کیا جا سکتا ہے، یا شاید ہمیں کو اچھا لگا۔ گرداگرد سرسبز پہاڑ ہیں، بیچوں بیچ دریا اور نہریں بہتی ہیں، یہاں کی عمارتیں، گھر، لباس، برتن، کھانے، رقص، موسیقی غرض ہر شے پر گرجستان کی قومی ثقافت کی بہت گہری چھاپ ہے اور یہاں کے بانکے چھبیلے لوگ ناچ گانے کے رسیا، کھانے پینے کے شوقین، رنگین مزاج اور تندخو جنہیں آہوئے دم خوردہ کی طرح رام کرنے میں غالباً کافی دن لگے ہوں گے۔ یہاں پر دو تین دن سیر و تفریح اور مسلسل ہاؤ ہو کے بعد آخر ہم ماسکو پہنچے۔

ماسکو

۱۹۵۸ء کا ماسکو، ماسکو جو اب بھی وہی ہے اور نہیں بھی ہے، ماسکو جو شاید ہمیشہ سے وہی ہے اور ہمیشہ بدلتا بھی رہا ہے۔ اول تو جب یہاں شری میٹوا ایئر پورٹ ہی نہیں تھا اور پرانا ایئر پورٹ ووکی دوا جس پر ہم اترے ایئر پورٹ کم اور کسی رئیس کا محل زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن حدِ نظر تک پھیلے ہوئے جنگل وہی تھے جو اب ہیں اور ان میں اونچے اونچے سفید نازک بدن پیڑ بھی وہی، لہلہاتا ہوا سبزہ بھی وہی، دریا بھی وہی، سرکاری دفاتر کے تکون گرجا نما میناروں والی عمارتیں بھی وہی، کریملن کے پیاز نما سنہری کلس اور یاقوتی ستارہ بھی وہی، بالشوئے تھیٹر بھی وہی، بے حد کشادہ سڑکیں بھی وہی، مجسمے بھی وہی، یادگاریں بھی وہی، لیکن پھر بھی یہ ماسکو کتنا مختلف تھا۔ اس کے افق پر چاروں طرف آج کل کی سر بفلک عمارتیں نہیں تھیں

ان کی جگہ عمارتیں بنانے والے کرین کھڑے تھے۔ کلینن ایونیو میں صف بستہ بلوریں عمارتوں کا جلوس نہیں تھا، استن کینا میں ٹی وی ٹاور کی فلک شگاف پنسل نہیں تھی، کتوزوف شاہراہ پر کوئی لدے پھندے اسٹور نہیں تھے، سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی ریل پیل نہیں تھی صرف مال بردار ٹرک دوڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دکانوں پر کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور گھریلو استعمال کی اشیا کی یہ افراط نہیں تھی، اتنے سینما نہیں تھے، اتنی فیشن ایبل لڑکیاں نہیں تھیں، اتنا اور بہت کچھ نہیں تھا لیکن ماسکو جب بھی یہی ماسکو تھا۔

پہلی نظر میں یہاں کی دو تین باتیں ہمیں بہت عجیب لگیں۔ اوّل تو یہ کہ سارے شہر میں کوئی اشتہار ہی نظر نہیں آیا نہ دیواروں پر نہ بسوں میں، نہ دکانوں کے اندر نہ جلتی بجھتی نیون روشنیوں میں۔ اشتہار اب بھی بہت کم نظر آتے ہیں جب تو بالکل ہی ناپید تھے۔ دوسری بات یہ کہ شہر خاموش کتا ہے، نہ موٹروں کے ہارن نہ بسوں کی دھڑ دھڑ، نہ سودا سلف بیچنے والوں کے آوازے، نہ تانگوں اور رکشاؤں کی گھنٹیاں۔ تیسری بات یہ کہ لندن، پیرس اور نیویارک کے کوچہ و بازار جیسی دھکم پیل بھاگ دوڑ، افراتفری کہیں نام کو نہیں۔ سب لوگ خراماں خراماں یوں چلے جا رہے ہیں جیسے انہیں دنیا میں کوئی کام ہی نہیں۔ نہ یہاں کوئی رش آور کا پتہ چلتا ہے، نہ انڈر گراؤنڈ اسٹیشنوں سے مخلوق ابلی پڑتی ہے، نہ بسوں پر سوار ہونے کے لئے لوگ دست و گریباں ہوتے ہیں۔ عجب سکون اور شانتی کا سماں ہے۔ برسوں کے بعد جب ہم جیل خانے سے نکل کر آتے تھے تو دو تین دن تک ہمیں گھر میں نیند نہیں آتی اس لئے جیل جیسا شور ہی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ لندن اور نیویارک سے آنے والے سیاح ماسکو پہنچ کر کچھ ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔

جب کبھی دیکھو سڑکوں سے راہگیر تو پھر بھی کہیں نہ کہیں جا رہے ہیں لیکن یہ ریڈ اسکوئر کے آس پاس ہر وقت کس خوشی میں میلہ لگا رہتا ہے۔ کچھ لوگ ویسے ہی کھڑے گپ کر رہے ہیں، کوئی ٹولی چہل قدمی میں مصروف ہے، کہیں فوٹو کھینچے جا رہے ہیں، کہیں آئس کریم اڑائی جا رہی ہے۔ اور شہر میں جدھر بھی جاؤ کیسی رنگ رنگ اور قسم قسم کی مخلوق چلی جا رہی ہے۔ یورپی، افریقی، ایشیائی، گورے، کالے، گندم گوں۔ پھر یہ لوگ پہلی نظر میں اپنی وضع قطع، لباس، پہناوے سے بے نیاز لگتے ہیں، نوجوان لڑکیاں تو خیر

فطری تقاضے سے فیشن کرنے اور بننے ٹھننے کی کوشش کرتی ہیں لیکن باقی لوگوں میں کوئی موٹا ہے، چھوٹا ہے لمبا ہے، دبلا ہے، سوٹ پہنے ہے یا مزدور کا اوور آل، ٹائی لگائے ہے یا بنیان میں پھر رہا ہے، بوڑھا ہے یا جوان، جیسا بھی ہے اپنے حال میں مگن ہے یوں لگتا ہے کہ کسی کو ان معاملات میں خود بینی چھو کر نہیں گئی۔ عجب بے فکری، لاابالی پن اور تن آسانی کا سا عالم ہے جو اور جگہ کم ہی دیکھا تھا۔

ماسکو میں پہلے تین چار دن کچھ وقت تو اسی ہوس سیر و تماشا اور تحیّر اور تجسّس میں گزرے اور باقی وقت پرانے اور نئے دوستوں کی صحبت میں۔ تاشقند میں ملاقاتیں تو ہو چکی تھیں لیکن کانفرنس کی مصروفیت کے باعث ان سے جی نہیں بھرا تھا۔ یہاں فراغت زیادہ تھی اس لئے کبھی دوپہر کو بیٹھک شروع ہوئی تو رات ہو گئی اور کبھی شام کو بساط جمی تو صبح ہو گئی۔ آپ بیتیاں بیان ہوئیں، شعر پڑھے گئے، لطیفہ بازی ہوئی۔ ایسی ایک صحبت مجھے اچھی طرح یاد ہے، سجاد ظہیر (بنّے) کے کمرے میں سب لوگ جمع تھے۔ مجھ سے شعر کی فرمائش ہوئی تو میں نے روزنبرگ والی نظم "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کچھ تمہید کے ساتھ سنائی اور اس کے بعد جب اس کا انگریزی ترجمہ ختم کیا تو ایک صاحب جو کونے میں خاموش بیٹھے تھے اچانک اٹھے اور آنکھوں پر رومال رکھ کر روتے ہوئے باہر چلے گئے۔ کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ امریکہ کے مشہور ترقی پسند سیاسی مبصر اور مصنف البرٹ کاہن ہیں جو روزنبرگ کے ذاتی دوست تھے اور آج کل اس جوڑے کے یتیم بچے انہیں کی تحویل میں ہیں۔

اور پھر ہمیں پہلی بار یہاں کے ایک پبلک رفاہی ادارے سے واسطہ پڑا اور یہاں کی معاشرتی زندگی کے اس پہلو سے کچھ شناسائی ہوئی۔

ماسکو آئے کچھ ہی دن ہوتے تھے کہ پہلے میری پنڈلیوں پر پھر چھاتی اور بازوؤں پر کچھ دانے نکل آئے۔ پہلے تو میں نے خیال نہیں کیا پھر خارش سے ذرا تکلیف شروع ہوئی تو میں نے مریم سلگانیک سے کہا ذرا ہوٹل کے ڈاکٹر سے کہو مجھے کوئی مرہم وغیرہ دے دے۔ یا اسے دکھلا ئیں۔ ڈاکٹر نے ایک نظر دیکھا اور کہا آپ کلینک میں جا کر معائنہ کروائیں۔ ادیبوں کی انجمن کی یہاں اپنی کلینک ہے جیسے اور بڑے اداروں کی ہیں۔ کلینک میں سب امراض کے ماہرین اور ہر مرض کی تحقیق و تشخیص کے لئے پورا ساز و سامان موجود رہتا ہے،

جب ہم پہنچے تو ڈاکٹروں کا پورا بورڈ جمع تھا، ہمیں پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھ چکے تو سب کچھ ایسے خوش نظر آ رہے تھے جیسے کوئی نعمت ان کے ہاتھ آ گئی ہو۔ پھر مترجم سے کچھ باتیں کیں۔ پتہ چلا کہ ایمبولنس گاڑی آ رہی ہے اور ہمیں کلینک سے ہوٹل کے بجائے سیدھا ہسپتال جانا پڑے گا۔ میں نے مترجم سے پوچھا ہسپتال کی کیا مصیبت ہے بھئی۔ کل میں نے بہت سی ملاقاتیں طے کر رکھی ہیں۔ ہمیں سے کوئی دوائی دے دیں ہم ہوٹل میں خود جو کرنا ہے کر لیں گے۔ مترجم نے کہا "ڈاکٹر تو اس بات پر خوش ہو رہے تھے کہ جلد کا یہ جرثومہ (VIRUS) کئی سال سے ان کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا کیونکہ یہ بیماری اب ہمارے ہاں پائی نہیں جاتی۔ اگر اتنے سال کے بعد ان کے ہاتھ یہ پہلا کیس آیا ہے تو تمہیں آسانی سے تھوڑی چھوڑیں گے"۔ کسی دور دراز جگہ ہم ہسپتال پہنچے اور وہاں داخلے کے بعد ہمیں اپنا جیل خانہ یاد آ گیا۔ باہر گارد لگی ہے اور ڈاکٹر بھی پاس دکھائے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ ہفتے میں صرف ایک دن ملاقاتیوں کو اندر آنے کی اجازت ہے اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے، باقی وقت آپ قید میں ہیں اور کھانا پینا نسخے کے مطابق۔ اس تجربے کی بنا پر میں آپ کو بتا دوں کہ اگر آپ سوویٹ یونین میں ہوں اور خدانخواستہ آپ کو نزلہ، سر درد یا پیٹ میں درد کی شکایت پیدا ہو اور آپ ڈاکٹر کو بلا بیٹھیں تو یہ مت سمجھئے کہ اسپرو کی گولی یا ہاضمے کے مکسچر سے آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ دوا تجویز کرنے سے پہلے آپ کے دل و دماغ، جگر، گردے، پھیپھڑے ہر چیز کا معائنہ ہو گا۔ ایکسرے کارڈیوگرام اور بقول پطرس بخاری مرحوم کے ایک (CAESARIAN) اپریشن کے علاوہ باقی ہر امتحان میں سے گزرنا پڑے گا اور پھر جا کر کہیں کوئی دوا تجویز ہو گی۔ البتہ خوشگوار بات یہ ہے کہ یہاں کے ڈاکٹر نرسیں اور ہسپتال کا عملہ عام طور سے مریضوں سے ایسے پیش نہیں آتے جیسے کوئی بیگار کاٹ رہے ہیں، یا مریض کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں جسے دوائی کے علاوہ شفقت اور ہمدردی بھی درکار ہے بلکہ کوئی اوپری اور بیگانہ شے یا (OBJECT) ہے جس سے ذاتی رابطہ پیدا کرنے کی کوئی حاجت نہیں، ہر کاروبار میں ذاتی تعلق کے دخل کی بات تو بعد میں آئے گی طب اور صحت عامہ کے بارے میں یہاں کا نظریہ یہ ہے کہ معاشرے کی سب سے بڑی دولت اس معاشرے کے افراد ہیں جن کی محنت سے دولت کی باقی سب صورتیں وجود میں آتی ہیں، اس لئے ان میں سے ہر فرد کی جان ایک نہایت قیمتی سرمایہ ہے جس کی پوری

نگہداشت معاشرے اور ریاست دونوں کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ پرانے محاورے میں پنگھوڑے سے قبر تک طبی عملہ ہر جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بچہ ہونے کے بعد زچہ کے گھر آتے ہی علاقے کا مقرر کردہ ڈاکٹر اور ایک نرس آ پہنچتے ہیں اور پھر سولہ برس کی عمر تک یہ بچہ اسی ڈاکٹر کی نگرانی میں رہتا ہے۔ بالغ ہونے پر ہر مرد عورت کو سال میں ایک بار ایکس رے کے لئے اپنے پولی کلینک میں عموماً حاضری دینی پڑتی ہے اور کوئی نہ جائے تو ملیشیا والے دروازہ پیٹنے لگتے ہیں۔ کلینک دو اقسام کے ہیں، ایک تو ہر علاقے کا عمومی کلینک ہوتا ہے اور دوسرا کسی نہ کسی ادارے سے مخصوص کلینک۔ مریض کی مرضی پر ہے کہ وہ اس میں جانا پسند کرے یا اس میں۔ اگر کسی کی طبیعت زیادہ ناساز ہے تو وہ ٹیلیفون پر اپنے ڈاکٹر کو گھر بلا سکتا ہے۔ زچہ اور بچہ کے لئے الگ مراکز ہیں جن سے ملحق اسٹور میں نومولود کی جسمانی پرورش کا ضروری سامان، یعنی بوتلیں، دودھ، وغیرہ ہمیشہ دستیاب رہتا ہے۔

تو سات آٹھ دن ہسپتال میں رہنے کے بعد تنہائی اور پرہیز سے دل اچٹنے لگا۔ خوش قسمتی سے اکتوبر انقلاب کے جشن کا دن آ گیا اور ہمیں بہت منت سماجت کے بعد رخصت کی اجازت مل گئی۔ ہوٹل پہنچے تو سبطے، بیدی، تاباں اور دوسرے دوست انتظار میں تھے۔ پوچھا کہو کیسے گزری، میں نے کہا "کچھ نہ پوچھو دوستو، ہسپتال میں اپنا ہم جنس کوئی نام کو نہ تھا سب عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ شیشۂ عصمت چکنا چور ہوتے ہوتے بچا۔"

غیر ملکی سیاح تو اب آنے لگے ہیں لیکن ماسکو میں پہلے بھی ایسا ہی ہجوم رہتا تھا۔ سب جمہوریتوں کے لوگ آتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی کام سے آیا اور کوئی سیر کی خاطر۔ شہر کی دکانیں بیشتر انہی لوگوں سے بھری رہتی ہیں۔ میں نے کسی سے پوچھا کہ آخر اتنے لوگوں کی شہر میں سمائی کیسے ہوتی ہے، ہوٹلوں میں اتنی گنجائش کہاں ہے۔ جواب ملا یہ یورپ نہیں ہے یہاں کا دستور یہی ہے کہ اگر کسی کا کوئی دوست، عزیز، رشتہ دار یا جان پہچان کا کوئی بھی شخص شہر میں موجود ہے تو جائیے اور بلا تکلف وہاں ٹھہر جائیے۔ گھر میں جگہ ہو نہ ہو مہمان کے لئے تو ہر صورت گنجائش پیدا کرنا لازمی ہے۔

ہماری ایک ملنے والی سنا رہی تھیں کہ اب تو شہر میں جگہ کی اتنی تنگی نہیں ہے لیکن ایک زمانہ وہ بھی

تھا جب ایک فلیٹ میں دو، دو، تین، تین خاندان رہتے تھے۔ ہمارے پاس بھی ایسا ہی ایک کمرے کا فلیٹ تھا جس میں ہم میاں بیوی اور دو بچے مقیم تھے۔ ایک دن جب میرے میاں کام سے کہیں باہر گئے ہوتے تھے ایک بڑی عمر کی خاتون دستک دے کر اندر آئیں اور پوچھا فلاں فلاں یہیں رہتا ہے۔ میں نے کہا جی وہ میرے میاں ہیں۔ کہنے لگیں، تو میں ان کی چچی ہوں، سائبیریا سے آئی ہوں، ابھی ابھی پنشن ملی ہے۔ جی چاہا کہ اب کام سے فراغت ہوئی ہے تو ماسکو ہی دیکھ آئیں، کہیں سے تم لوگوں کا پتہ لیا اور چلی آئی۔ میں نے کہا آپ ہی کا گھر ہے تشریف رکھیے۔" میرا خیال تھا کہ ایک آدھ دن کی مہمان ہوں گی لیکن پورا ایک مہینہ ہمارے ہاں براجمان رہیں۔ اور بعد مجھے میرے میاں سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی چچی بھی نہیں تھیں بلکہ ان کے چچا کی ساس کی کوئی بھانجی بھتیجی تھیں۔ خاندان، رشتے، گھریلو تعلقات، ہمسایہ گیری، دوستانہ میل ملاپ ان سب کی وہی پرانی مشرقی روایتی وضع قائم ہے اور اس ڈھانچے کو ابھی تک نہ صرف مغربی معاشرے کی سی شکست و ریخت کا سامنا کرنا نہیں پڑا بلکہ اس نئے نظام میں باہمی قربت اور یگانگت کی کئی نئی بنیادیں قائم ہو گئی ہیں۔ مثلاً مغربی ممالک میں تو شادی کے بعد نئے بیاہتا جوڑے کو سب سے پہلے الگ گھر بسانے کی فکر لاحق ہوتی ہے اور یہاں پر اس کے برعکس نوجوان والدین کو کسی دادا ابا یا نانی اماں کی خوشامد رہتی ہے کہ وہ ان کے پاس رہیں اور ان کی مصروفیت کے اوقات میں ان کے بچوں کی دیکھ بھال کریں یا گھر کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ بچپن میں ہم کئی دکانوں پر لکھا ہوا دیکھا کرتے تھے "ادھار محبت کی قینچی ہے۔" بڑے ہو کر معلوم ہوا کہ ہر کاروباری معاشرے میں محبت کی صرف یہی ایک قینچی نہیں ہے اور بھی بہت سی قینچیاں ہیں۔ لیکن ایک غیر طبقاتی نظام میں صرف چند مندرجہ بالا خاندانی یا دوستانہ رشتوں ہی کی نہیں ہر طرح کے تعلقات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً اوپر کہیں روزمرّہ کاروبارِ زندگی میں ذاتی رسم و راہ کا ذکر آیا تھا۔ یورپ اور مغربی ممالک میں تو یوں ہے کہ کسی اجنبی سے بے وجہ بے تکلفی برتنا جسے TAKING LIBERTIES کہتے ہیں بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ سب لوگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں، کوئی ڈاکٹر ہے تو کوئی مریض، کوئی گاہک ہے تو کوئی دکاندار، کوئی ڈرائیور ہے کوئی مسافر، کوئی آقا ہے کوئی ملازم۔ ان میں باہمی بول چال کے قاعدے مقرر ہیں جن سے تجاوز کرنا بدتمیزی کے مترادف ہے۔ لندن کی بسوں میں ٹکٹ کاٹنے

والی خاتون یا سگریٹ کی دکان پر کوئی بڑی بی کبھی آپ کو پیارے، پیاری، یا میری جان ضرور کہیں گی لیکن یہ الفاظ محض محاورۃً استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی ذاتی خطاب مقصود نہیں ہوتا ہے۔ اس بیگانگی کی وجہ بھی ظاہر ہے، سرمایہ داری نظام میں ہر کسی کو چوکنا رہنا پڑتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص دوستی یاری کا بھلاوا دے کر کوئی فائدہ نہ اٹھا جائے۔ یہاں کا معاملہ بالکل برعکس ہے، ٹیکسی میں ڈرائیور کے ساتھ کوئی سواری آ کر بیٹھے تو چھوٹتے ہی آپس میں گہری چھننے لگتی ہے، ہوٹل میں آپ نے ناشتہ ٹھیک سے نہیں کیا تو کھانا چھننے والی ملازمہ شکایت کرے گی اور آپ کے مترجم سے پوچھے گی انہیں ہمارا کھانا پسند نہیں آیا یا طبیعت اچھی نہیں۔ دفتر میں افسر اور ماتحت، کارخانے میں مینجر اور کاریگر سب آپس میں ایسے ہی بے تکلف دوستانہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ یہاں جی جناب اور حضور سرکار جیسے الفاظ کوئی جانتا ہی نہیں، ہر کوئی یا تو کامریڈ ہے یا اپنے پہلے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اگر تکلف ہی مقصود ہو تو کسی کا پورا نام لے دیا یعنی اس کا ذاتی نام اور باپ کا نام جیسے آندرے پتروویچ یعنی محمد بخش اللہ بخش۔ یہاں دفتری یا انتظامیہ کاروبار میں تو حفظ مراتب اور ڈسپلن ضرور ہے بلکہ بہت ہے۔ آمدنی اور آسائش میں بھی اونچ نیچ موجود ہے لیکن سوشیل اور ذاتی تعلقات میں کمتری اور برتری تسلیم کرنے کو شاید ہی کوئی تیار ہو۔

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہاں صرف فرشتہ صفت لوگ بستے ہیں جن میں جملہ انسانی کمزوریوں کا صفایا ہو چکا ہے۔ لوگوں سے دوستانہ بڑھا تو ایسے کئی قصے سننے میں آتے اور سن کر کچھ اطمینان بھی ہوا کہ یہاں بھی محبتیں ناکام ہوتی ہیں، دل ٹوٹتے ہیں، رقابتیں چلتی ہیں، ساس بہو کی لڑائی ہوتی ہے، لڑاکا بیویاں بھی پائی جاتی ہیں اور بدمزاج شوہر بھی۔ چنانچہ غم دوراں کا تو بہت سا علاج لوگوں نے ڈھونڈھ لیا ہے لیکن غم جاناں کا نسخہ ابھی کسی کے ہاتھ نہیں لگا۔ اور نہ ہی لگے تو اچھا ہے ورنہ ہمارے کئی شاعر دوست کیا کریں گے۔

البتہ غم دوراں سے نجات کے کئی پہلو سامنے آئے۔ ہمارے ہاں ایک پرانی کہاوت ہے جو اب ذرا کم سننے میں آتی ہے کہ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے پیسے کا کیا سوچنا۔ یہ غالباً ان وقتوں کی بات ہوگی جب پرانے نوابوں اور امیر امراء کو ضرورت کی ہر چیز اپنی رعایا کی محنت سے بہم پہنچ جاتی تھی اور پیسہ محض گلچھرے اڑانے کے کام آتا تھا۔ اب یہ بات کہاں رہی ہے۔ اب تو کاروباری دنیا میں ہر پیسے کو دو چار بار الٹ پلٹ کر

دیکھتے ہیں کہ اگر ضرورت سے فاضل ہے تو اس سے مزید پیسہ کیسے پیدا کیا جائے اور اگر کم ہے تو روٹی، کپڑا، مکان، دوا دارو، کون سی ضرورت پہلے پوری کی جائے۔ سوویت سرزمین میں پیسے کی واقعی یہی حیثیت نظر آتی ہے۔ ماسکو جیسا بڑا شہر ہو یا کوئی چھوٹا سا قصبہ کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے اور گھریلو سازوسامان کی دکانیں تو ویسے ہی کھچا کھچ بھری رہتی ہیں اور ہر جگہ یہی کیفیت نظر آتی ہے کہ لوگ پیسہ خرچنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ جب ہم پہلے پہل یہاں آئے تھے تو ضرورت کی بہت سی چیزیں کمیاب تھیں، خاص طور سے دساور کا مال بہت ہی کم دیکھنے میں آتا تھا اس لئے دکانوں پر بھیڑ بھاڑ کچھ عجب نہیں لگی اب یہ کیفیت نہیں رہی۔ اوّل تو یورپ کے دوسرے سوشلسٹ ممالک میں کئی طرح کا عمدہ مال تیار ہونے لگا ہے جو کئی جگہ دستیاب ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اب سرمایہ دار ملکوں سے بھی تجارت میں اتنا اضافہ ہو چکا ہے کہ وہاں کی بنی ہوئی چیزیں اب بھی کمیاب تو ہیں لیکن پہلے کی طرح کوئی عجوبہ نہیں ہیں۔ اسی تناسب سے اب چھوٹی موٹی دکانوں کے بجائے بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹ اسٹور کھل گئے ہیں جہاں ہر طرح کا مال مہیا ہے لیکن اس کے باوجود خریداروں کے ہجوم میں کمی کی بجائے اضافہ ہی نظر آتا ہے۔ خیر یہ تو شاید کچھ ایسی بات نہیں۔ ایک بار ہم ماسکو سے اپنی مترجم کے ہمراہ لینن گراڈ جا رہے تھے راستے میں اس کے بٹوے پر میری نظر پڑی تو اس میں دس دس روبل کے نوٹوں کی کئی گڈیاں رکھی تھیں۔ کہنے لگیں وہاں سے کچھ خریدنا ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہیں اپنی صاحبزادی کے لئے ایک بربط قسم کا ساز ہارپ درکار ہے۔ جو لینن گراڈ میں تیار ہوتا ہے اور جس کے دام سترہ سو روبل ہیں جو آج کل ہمارے حساب سے سترہ ہزار روپے بنتے ہیں۔ اس فضول خرچی پر ہم نے احتجاج کیا تو کہنے لگیں بھئی آخر فالتو پیسہ کہیں تو خرچ کرنا ہے، اگر ہم کبھی پیسہ جوڑتے ہیں تو اسی غرض سے کہ اسے فلاں چیز پر خرچ کریں گے، موٹر خریدی، ڈاچا بنا لیا، گھر کے لئے کوئی قیمتی چیز خرید لی، بنک میں رکھ کر اسے بڑھانے سے فائدہ ہے روپے پیسے سے بے فکری تو غم روزگار سے فراغت کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو اس فراغت اور اوقات فرصت کو کسی مصرف میں لانے کا ہے۔ ہمارے بزرگوں نے تو اس کے لئے ایک ہی مشغلہ تجویز کیا تھا یعنی "غم نداری بز بخر" جب بکری پالنا واقعی کوئی دلچسپ کام رہا ہوگا۔ اب اس تفریح میں کیا رکھا ہے چنانچہ یہاں پر کچھ

شوق تو لوگوں نے خود پال رکھے ہیں اور بعض کی تسکین اجتماعی طور سے ریاست اور معاشرتی ادارے بہم پہنچاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ماسکو میں ایک میوزیم ہے جہاں لوگوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں رکھی ہیں، گھاس پھونس سے بنائی ہوئی تصاویر، مناظر، شبیہیں، سوکھی ہوئی شاخوں، لکڑی اور لوہے کے کاٹھ کباڑ سے تراشے ہوئے مجسمے اور ایبسٹریکٹ ڈیزائن، مختلف قسم کے پتھروں، دھاتوں اور سیپیوں سے بنائی اور سجائی ہوئی آرائشی اشیاء۔ ہر چیز محنت، ذوق اور ہنر کا بہت عمدہ نمونہ۔ کچھ عرصے پہلے ماسکو میں ایک نمائش لگائی گئی تھی جو مختلف پیشہ ور لوگوں نے کہ لیجیے ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں وغیرہ نے مائکرو اگزیبیشن کے نام سے ترتیب دی تھی۔ اسے خوردکاری کہہ لیجیے۔ اس کا خاصہ یہ تھا کہ آپ خوردبین کے بغیر اس میں رکھی ہوئی چیزیں دیکھ ہی نہیں سکتے تھے، چاول کے دانے پر سورۂ فاتحہ لکھی ہوئی تو ہم نے دیکھی ہے لیکن مکئی کے دانے پر ایک جانب شطرنج کی بساط اور پورے مہرے کھڑے ہوئے تھے اور دوسری جانب ایک مشہور آرٹسٹ کی تصویر کا رنگین چربہ۔ بال کی کھال نکالنا ہم سمجھتے تھے کہ محض محاورہ ہے لیکن اس نمائش میں کسی کاریگر نے نہ صرف بال کی کھال نکالی تھی بلکہ اس کھال کے اندر آپ سرخ اور سبز رنگ کے ذرّوں سے بنا ہوا گلاب کا پھول اور اس کی پتّیاں بھی دیکھ سکتے تھے۔ خیر یہ کام تو پیشہ ور لوگوں نے کیے ہوں گے کسی عام انسان کی بات لیجیے۔ ایک بار اپنی مترجم اولگا کے ساتھ ٹیکسی میں کہیں جا رہے تھے تو ٹیکسی ڈرائیور نے اولگا کو سگریٹ پیش کیا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں سگریٹ پیتی ہوں ہے" "مجھے تمہارے بارے میں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے" ڈرائیور صاحب بولے "تمہیں دفتر میں آتے جاتے کئی بار دیکھا ہے۔" معلوم ہوا کہ یہ صاحب نفسیات اور قیافہ شناسی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔

ماسکو میں ہر قسم کی مخلوق کا ذکر ہوا تھا، مگر وہ تو اس شہر کی محض جھلکیاں تھیں، اس شہر میں تو محض اس پوری سرزمین کی برادری کتنی رنگا رنگ اور بوقلموں ہے اس کا حال بعد جا کر کھلتا ہے۔ کسی نے بتایا تھا کہ داغستان میں جب صبح ریڈیو پروگرام شروع کرتے ہیں تو اناؤنسر کو چھبیس زبانوں میں دعا سلام اور صبح بخیر کہنا پڑتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے لطیفہ ہو لیکن اتنی بات پکی ہے کہ آج کل یہاں مختلف علاقوں کی چھہتر زبانوں میں تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ظاہر ہے کہ اتنی ہی مختلف تہذیبیں بھی رائج

ہیں۔ ان میں بہت وسیع علاقے اور بڑی آبادیاں بھی شامل ہیں جیسے روسی وفاقی جمہوریہ ہے اور ذرا ذرا سے علاقے اور چھوٹی چھوٹی قومیتیں بھی۔ جیسے کالمیک ہیں یا باشکیر ہیں، شمال، جنوب، مشرق، مغرب کسی سمت نکل جائیے چند سو میلوں کے بعد زبان، لباس، تعمیرات، بود و باش غرض ہر شے کا نقشہ بدل جاتا ہے۔ ان میں جدید طرز کے عالیشان شہر بھی شامل ہیں پرانے کچے مکان کے گاؤں بھی، سائبیریا کے شکاریوں کے چوبی گھروندے بھی ہیں، قازقستان کے گڈریوں کے اونی خیمے بھی۔ ہر علاقے کی اپنی تاریخ ہے، اپنے ہیرو ہیں، جارجیا یعنی گرجستان میں رستاویلی کا چرچا ہے تو ازبکستان میں علی شیر نوائی کے گن گاتے ہیں۔ استھونیا اور لیٹویا کے رہنے والے کالوف کو ہیرو مانتے ہیں تو لینن گراڈ کے باشندے پیٹر اعظم پر نازاں ہیں۔ اتنا کچھ تو غالباً کسی ابتدائی کتاب سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بھان متی کا یہ کنبہ کیسے بن گیا ہے، اور اتنی مختلف تہذیبوں، معاشرت کی اتنی اونچی نیچی سطحوں، اتنی قومیتوں کے ڈھنگ ڈھنگ کے روایتی مزاج اور کردار سے وہ چیز کیسے برآمد ہوئی ہے جسے ایک مشترکہ سوویٹ تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اس کے مادی اور اقتصادی عوامل تو ایک ہی نظر میں سامنے آجاتے ہیں مثلاً اگر آپ ماسکو کے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں تو بہت ممکن ہے کہ جو مچھلی آپ کے سامنے رکھی ہے وہ کامچاٹکا سے آئی ہو اور جو گوشت آپ کھا رہے ہیں ایستھونیا سے، سیب مولدویا کے باغات کا ہو اور نارنگی گرجستان کی۔ جو لباس آپ نے پہنا ہے اس میں قراقلی سمرقند کی ہو اور سمور سائبیریا کا۔ یا ریل میں سفر کر رہے ہوں تو ریل کا ڈبہ ریگا کے کارخانے میں بنا ہو اور انجن لینن گراڈ میں، یعنی سوویٹ یونین کی پوری سرزمین ایک ایسی وسیع مشترکہ منڈی ہے جس میں لین دین کے اور منافع اور خسارے کے وہ تضادات موجود نہیں جن سے یورپ کی مشترکہ منڈی میں ہر روز فساد برپا رہتا ہے۔ یہ تو ایک بات ہوئی۔ تہذیب و تمدن کی طرف آئیے تو ذرا مختلف صورت میں ایسا ہی نقشہ وہاں نظر آئے گا۔ یہاں کی بیشتر برادریاں ایسی ہیں جنہیں انقلاب کے بعد پہلی بار صدیوں کی زبردستی اور پسماندگی سے چھٹکارا حاصل کرکے علامہ اقبال کی اصطلاح میں اپنی خودی کو پہچاننے اور اپنے ادب و فن کو فروغ دینے کا موقعہ ملا ہے۔ اور چونکہ سوویٹ یونین ان کی یونین یا اتحاد ہے، ان کا ادغام یا وحدت نہیں ہے اس لئے مال و

جنس کی مشترکہ منڈی کی طرح یہاں وہ اچھوتی چیز پیدا ہوتی ہے جسے تہذیبی یا ثقافتی مشترکہ منڈی کہنا چاہیئے۔ روسی زبان کو اس منڈی کا سکّہ یا زرِ مبادلہ تصوّر کر لیجئے جس کے وسیلے سے ہر جگہ کا مال ہر دوسری جگہ پہنچ سکتا ہے۔ روس کے شولوخوف ہوں یا سائبیریا کے شوکشن، کرغزیہ کے چنگیز اِتماتوف ہوں یا داغستان کے رسول حمزہ، جارجیا کے ایراکلی اباشدزے ہوں یا تاجکستان کے ترسون زادہ ان کی تحریریں ہر علاقے میں یکساں مقبول ہیں اور اس مشترکہ منڈی کا مشترکہ سرمایہ۔ یہی صورت کلاسیکی ادب کے شاہ پاروں کی بھی ہے اور دوسرے فنون، رقص، موسیقی، مصوری اور عمارت گری کی بھی۔ آج آرمینیا کا کوئی طائفہ سائبیریا میں کسی کو محظوظ کر رہا ہے تو کل یوکرائن کا کوئی رقاص یا آذربائیجان کا کوئی موسیقار ریگا میں اپنے کمالات دکھا رہا ہے۔ پھر ان لوگوں میں ارتباط اور اختلاط کی اور صورتیں بھی ہیں۔ مختلف اہلِ ہنر کی مقامی تنظیموں کے علاوہ ایک مرکزی تنظیم بھی ہے۔ ادیبوں کی انجمن ہے، اداکاروں کی انجمن ہے، اور دوسرے پیشہ وروں کی تنظیمیں ہیں۔ اسی طرح مقامی کلینک، سینی ٹوریم وغیرہ کے علاوہ بعض صحت افزا مقامات پر مرکزی آرام گاہیں بھی ہیں مثلاً شمال میں ریگا کے قریب ڈبونٹی ایک قصبہ ہے جس میں بحرِ بالٹک کے کنارے چیل کے پیڑوں میں گھری ہوئی کئی منزلہ ایک آرام گاہ ادیبوں کے لئے مخصوص ہے جہاں موسم گرما میں مختلف علاقوں کے لکھنے والے جمع ہوتے ہیں۔ اس روداد کے کچھ صفحات میں نے وہیں بیٹھ کر لکھے ہیں۔ جنوب میں ایک ایسی ہی آرام گاہ بحرِ اسود کے کنارے گاگرا کے مقام پر ہے، ان آرام گاہوں میں مختلف تقاریب پر جلسے اور محفلیں تو برپا ہوتی ہی رہتی ہیں۔

اس مشترکہ منڈی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گاہک کسی مخصوص پڑھے لکھے یا خوش حال طبقے کے افراد نہیں اور یہ بھی نہیں ہے کہ اس میں صرف یہیں کے مال کی نمائش کی جائے۔ ماسکو میں میں نے پیرس سے آئی ہوئی مونا لیزا کا دربار دیکھا ہے، اسپین سے درآمد کی ہوئی گویا کی تصاویر دیکھی ہیں۔ مصر سے لائے ہوئے فراعنہ کے نوادرات دیکھے ہیں۔ ایسے شاہکاروں کی زیارت کے لئے ہمیشہ شائقین کی میل دو میل لمبی قطار لگی رہتی ہے اور آپ کچھ نہیں بتا سکتے کہ ان میں کون کون ہے۔ طلباء اور طالبات بھی ہیں، ٹیکسی ڈرائیور بھی، ہوٹل کے بیرے بھی، کارخانوں کے مزدور بھی، وزیروں کی بیگمات بھی اور ان کی مامائیں

بھی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ فن و ہنر اور تہذیب و تاریخ کا ذوق و شوق ایک طرح سے بچّوں کی گھٹّی ہی میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کوئی نمائش گاہ ہو، تاریخی عمارت ہو، آرٹ گیلری ہو بچّوں کی ایک فوج اپنی استانیوں سمیت ہمیشہ موجود ہوگی، بچّوں کے مدرسے اور کھیل کے میدان تو ہر محلّے کے کسی احاطے میں ہیں ہی (احاطے میں اس لئے کہ بچّوں کو سڑک پار نہ کرنی پڑے) لیکن یوں لگتا ہے کہ ہر تہذیبی مرکز نے اپنا ایک دبستان کھول رکھا ہے۔

ان سب باتوں پر مستزاد وہ تاریخی تجربے ہیں جن سے یہ پوری برادری گزری ہے، یعنی اکتوبر انقلاب اور دوسری جنگ عظیم۔ ان دونوں معرکوں میں سب نے مل کر جنگیں لڑی ہیں۔ جانیں دی ہیں، خون بہایا ہے، جس کی یادگاریں شہر شہر اور قریہ قریہ قائم ہیں اور یہی دو نعرے، انقلاب اور امن ان کے فکر و عمل پر حاوی ہیں۔

ماسکو کی بات ہو رہی تھی جو کہیں سے کہیں نکل گئی۔ حال ہی میں ایک فلم فیسٹول میں ایک امریکن لڑکی سے ملاقات ہوئی، جس نے ہمارے ایک پاکستانی عزیز جمیل دہلوی کی فلم میں کام کیا تھا۔ ایک شام ہم شو دیکھ کر نکلے تو بولیں ہم ہوٹل سے باہر کہیں پیدل گھومنے چلے جائیں۔ میں نے کہا "چلی جاؤ روکتا کون ہے؟"

کہنے لگیں "لیکن سڑک ذرا ویران ہے اور اندھیرا بھی ہو چلا ہے"

میں نے کہا "پھر"

بولیں "کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟"

"کیسا خطرہ؟ یہاں تو رات بھر لوگ کام کاج سے آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"سچ، نیویارک میں تو اب میں اکیلی یا کسی اجنبی کے ساتھ لفٹ کے ذریعہ چڑھتے اترتے ہوئے ڈرتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ نیویارک نہیں ہے، ماسکو ہے۔"

مناظر
سائبیریا وغیرہ

جب ہم سائبیریا کے صدر مقام نوووسی برسک کے ہوائی اڈے پر اترے تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہاں پر تو گرمی بہت ہے۔ غالباً جون کا مہینہ اور چلچلاتی دھوپ تھی۔ اپنے ذہن میں تو سائبیریا کی برف کا وہی تصور موجود تھا جو دوستوئیفسکی، شیشکوف اور دوسرے کلاسیکی ادیبوں سے ہم نے اخذ کیا تھا اور اکتوبر انقلاب سے پہلے یا بعد کے جو قصے سن رکھے تھے وہ بھی اسی کی تائید کرتے تھے کہ اس ہولناک علاقے میں صرف وحشت ناک جنگل ہیں خوفناک دلدلیں ہیں اور چٹیل پہاڑ ہیں۔ یہاں دن رات برف گرتی ہے اور اس بلا کی سردی پڑتی ہے کہ جن مظلوموں کو یہاں سیاسی جرائم کی پاداش میں مشقت کے لئے بھیجا جاتا ہے ان کے ہاتھ، پاؤں، سر، پیر یہاں تھوڑے ہی دنوں میں ٹھنڈ اور پالے سے یخ بستہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے اس تپش پر حیرت کا اظہار کیا تو میرے میزبان بولے "دیکھیے یہ ماسکو نہیں ہے کہ جہاں کبھی گرمیوں کے موسم میں لوگ ٹھٹھرنے لگتے ہیں اور کبھی سردیوں میں تیز گرمی نہ سہی لیکن موسم بہار کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ ہمارے ہاں کے موسم اس قسم کی دھوکہ بازی نہیں کرتے۔ یہاں گرمی کا موسم ہے تو گرمی ہے اور سردی کا موسم ہے تو سردی۔ یہ ماسکو والے تو صفر سے دس بیس درجے پارہ نیچے گر جائے تو چلانے لگتے ہیں لیکن یہاں تو نقطۂ انجماد سے تیس چالیس ڈگری نیچے کوئی بات نہیں۔ اور صاحب آپ جس موسم میں آئے ہیں یہ تو سائبیریا دیکھنے کا کوئی موسم نہیں ہے۔ یہاں کی بہار دیکھنا ہے تو سردیوں میں آئیے۔"

ہم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس بہار سے محفوظ رہے۔

یہ ہمارے میزبان جو ہمیں ہوائی اڈے پر لینے آئے تھے، نوووسی برسک شہر کے میئر صاحب

تھے، پورا نام تو ذہن میں نہیں صرف فلی پوف یاد ہے۔ ادھیڑ عمر، میانہ قد، کھچڑی بال، تیکھے نقش، اکہرا لیکن کسرتی بدن، چال ڈھال سے فوجی معلوم ہوتے تھے جس کی تصدیق ان کے سادے سے کوٹ پر تمغوں کے ربن کر رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جنگِ عظیم کے دوران میں وہ سوویٹ بحریہ کے افسر تھے اور دو بار زخمی ہو چکے تھے۔ ہوائی اڈے سے روانہ ہوئے، کافی دُور تک لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھروں کی قطار چلی گئی تھی جن کا نقشہ کچھ گڑیا کے گھروندوں سے ملتا جلتا ہے اور روس کے دیہاتی علاقوں میں ابھی تک اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، ایسی ہر کٹیا کے ارد گرد ایک چھوٹا سا قطعہ پھل، پھول اور ترکاریوں کا ہے اور اس کے گرد لکڑی کی باڑھ۔

فلی پوف صاحب نے کہنا شروع کیا "یہ لکڑی کے گھروں کی جو بستی آپ دیکھ رہے ہیں اسے ہی انقلاب سے پہلے کا نوووسی برسک سمجھ لیجیے۔ ایسا ہی گمنام سا ایک گاؤں تھا۔ اب شہر والے یہ گھر اپنی مضافاتی آرام گاہ کے طور سے استعمال کرتے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر ان کی ذاتی ملکیت ہیں۔ انقلاب سے پہلے یہاں نہ بجلی تھی نہ گیس، نہ ریل نہ پکی سڑک۔ میں تاریخ دان نہیں ہوں اس لئے مجھے یاد نہیں کہ یہ کس رئیس کی جاگیر تھی بہرحال کسی کی ہوگی ضرور اور ان گھروں میں اس کے غریب مزارع رہتے ہوں گے اور اب جو شہر ہم نے آباد کیا ہے وہ تو آپ دیکھ ہی لیں گے۔" پھر کچھ معذرت آمیز لہجے میں کہنے لگے "ویسے مجھے معلوم ہے کہ آپ ادیب ہیں اور ثقافتی امور میں دلچسپی رکھتے ہیں، بھلا ماسکو کے بعد ہم آپ کو کیا دکھائیں گے۔ ہمارے پاس نہ کریملن جیسا محل ہے، نہ بالشوئی تھیٹر ہے، نہ ماسکو کی سی نوادر گاہیں ہیں نہ ویسے تاریخی آثار ہیں۔ ہمارا تو بالکل نو آباد شہر ہے، اس میں یہ سب کچھ کہاں سے آتا۔ بہرحال آپ کی کرم فرمائی ہے کہ آپ تشریف لائے۔" مجھے بالکل یوں لگا جیسے اپنے ہاں بہت مکلف دعوت سے پہلے کوئی کہہ رہا ہو کہ آپ کے قابل تو نہیں لیکن گھر میں جو دال روٹی میسر آسکی حاضر ہے۔

ہم شہر کے قریب پہنچے تو میزبان صاحب کا لہجہ بدلنا شروع ہوا۔ "یہ سڑک جس پر ہم جا رہے ہیں لینن گراڈسکی پراسپیکٹ (شاہراہ) ہے۔ اسی نام کی ایک سڑک ماسکو میں بھی آپ نے دیکھی ہوگی۔ لیکن ہر لمبان چوڑان میں ماسکو والی سڑک کا اس ہماری سڑک سے کوئی مقابلہ نہیں۔"

اب ہم قریب قریب شہر میں پہنچ چکے تھے، ایک سبزی مائل نیلگوں رنگ کی گرانڈیل عمارت پر نظر پڑی تو میر صاحب بولے، یہ عمارت دیکھتے ہیں، یہ ہمارا ریلوے اسٹیشن ہے، ماسکو میں کوئی ریلوے اسٹیشن اس کے برابر کا نہیں ہے۔" یہ ہمارا اوپیرا گھر اور تھیٹر ہے۔ اس میں ماسکو کے بالشوئی سے کہیں زیادہ نشستیں ہیں۔" غرض یہ کھلا کہ ماسکو والے کسی بات میں سائبیریا کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہاں کا دریا، یہاں کی جھیل، یہاں کی سائنس اکادمی، یہاں کی سڑکیں، سٹیشن، تھیٹر، ہر چیز ماسکو کو شرماتی ہے۔ اور جب شام کو ہم کھانے پر بیٹھے تو میر صاحب نے حرفِ آخر کے طور سے ایک پورا گلاس برانڈی سے بھرا اور پوچھا ماسکو میں کوئی ہے جو یہ پورا گلاس دم لئے یا پانی پیئے بغیر یکبارگی پی سکے۔ یہ کہا اور غٹ غٹ پی گئے۔ پھر بولے "بھئی یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی متعصب سائبیرین ہوں، میرا اصل وطن تو لینن گراڈ ہے۔ بڑی لڑائی کے بعد جب سائبیریا میں کام کرنے کے لئے رضاکاروں کی طلبی ہوئی تو میں بھی چلا آیا اور اب یوں لگتا ہے کہ اگر میں نے ساری زندگی میں دانشمندی کا کوئی کام کیا ہے تو یہی تھا۔"

دن بھر ہم نے شہر کے مختلف علاقے دیکھے، دریا کی سیر کی، اوپیرا سنا اور اگلے دن میر صاحب کے ساتھ سائبیریا کی شہرہ آفاق سائنس اکادمی کا طواف کرنے پہنچے۔ قطار در قطار بلند و بالا عمارتوں کا سلسلہ بنی جگہ لیکن اب عمارتوں کا ہم پر کچھ ایسا رعب نہیں پڑتا البتہ جب اکادمی کے ڈائرکٹر صاحب نے اس خطے کے قدرتی ذخائر کا بیان شروع کیا اور اس کی وضاحت میں مختلف نقشے، چارٹ، تصاویر دکھائیں اور اعداد و شمار کا پلندہ سامنے رکھا تو اپنے تاثر کے لئے اگر کوئی موزوں لفظ مجھے ملتا ہے تو وہ "ہیبت" ہے۔ کچھ ایسا تاثر جو پرانے زمانے کے طلسماتی افسانوں سے پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا، اس سرزمین سے ابھی تک ہم نے جو کچھ برآمد کیا ہے وہ تو پہاڑ کے مقابلے میں رائی کے برابر سمجھو، پھر بتایا کہ اس علاقے میں تیل کے اتنے کنوئیں ہیں جو کھود کر بند کر دیئے گئے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ وہاں رسل و رسائل کے بندوبست پر خرچ بہت ہوگا اور ہم اس پیسے کو کسی بہتر مصرف میں لا سکتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ ہمیں فی الحال مزید تیل کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد نقشے میں کچھ اور مقامات دکھائے۔ یہاں سونے کی سر بھر کانیں ہیں، یہاں لوہے کی، یہاں کوئلے کی، یہاں ہیرے جواہرات کی، "کبھی دس لاکھ ڈالر (ایک

ملین) تمہاری مٹھی میں آتے ہیں بے؟" مجھ سے اچانک سوال کیا۔ "دس لاکھ کیا میں نے دس ہزار بھی ان آنکھوں سے نہیں دیکھے۔" میں نے جواب دیا۔ "اچھا تو یہ لو!" انہوں نے ایک دراز سے شیشے کی ایک نلکی نکالی اور مجھے تھما دی جس میں چھوٹے بڑے جگمگ جگمگ ہیرے بھرے ہوئے تھے۔ "ان کی قیمت دس لاکھ ڈالر سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔"

پل بھر کے لئے لکھ پتی بننے کا یہ ہمارا پہلا اور غالباً آخری اتفاق تھا۔ نوووسی بر سک کا شہر تو دیکھنے میں کچھ ویسا ہی سب ہے جیسے روس کے دوسرے نوآباد شہر ہیں، سیدھی اور بہت کشادہ سڑکیں، درمیان میں سبزہ اور درخت، دو رویہ بلند و بالا سفید، پیلے اور مٹیالے رنگ کی عمارتیں، یکساں فاصلے پر چوک یا اسکوائر جس میں کسی قومی ہیرو کا مجسمہ نصب ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس شہر کو دیکھنے سے سائبیریا کی سرزمین کے اصل روپ کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ اندازہ تب ہوا جب ایک آدھ دن کے بعد ہم پہلے کچھ دیر کے لئے اومسک کے کے قصبے میں رکے اور پھر برسک پہنچے۔ اومسک وہی جگہ ہے جہاں دوستوفسکی نے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائی تھیں۔ ان دنوں کی یادگار کے طور پر اس قدیم جیل خانے کی ہیبت ناک دیوار بھی اب تک موجود ہے۔ اب تو خیر اس شہر میں جدید زمانے کی سب آسائشیں موجود ہیں۔ بجلی ہے، سڑکیں ہیں، اور ہر عمارت باقی شہروں کی طرح گرم پانی سے مستقل گرم رکھی جاتی ہے۔ اب کسی کو تعزیر کے لئے یہاں بھیجا بھی جائے تو اس میں عقوبت کا کوئی انوکھا پہلو دکھائی نہیں دیتا لیکن زار شاہی کے زمانے کا تصور کیا جائے تو اس خیال سے واقعی دل میں ہول اٹھنے لگتا ہے کہ پرانے زمانے کے اسیر اس سنسان بیابان کی دہشتناک تیرہ و تار تنہائی، یہاں کی کٹیلی برف بار ہوا اور یہاں کی دلدل میں پلے ہوئے مچھروں اور بھنگوں کے دل بادل سے کیسے نپٹے ہوں گے اور جو کڑی مشقت ان سے لی جاتی تھی ان کے فاقہ زدہ جسم اسے کیسے برداشت کرتے ہوں گے۔

پھر ہم براتسک پہنچے جس کے بارے میں صرف اتنا پڑھ رکھا تھا کہ یہاں دنیا کا پہلا یا دوسرا سب سے بڑا پن بجلی گھر ہے۔ سائبیریا سے صحیح معنوں میں ہمارا تعارف یہیں پر ہوا۔ جنگل تو ماسکو کے آس پاس بھی بہت ہیں اور آپ ارضِ روس کا تصور کرنے بیٹھیں تو سب سے پہلے برف اور ہرے بھرے

جنگلات ہی کا نقشہ ذہن میں ابھرتا ہے لیکن ماسکو کے تہذیب یافتہ چھوٹے موٹے جنگل جن پر حضرت انسان نے پورا قبضہ جما رکھا ہے اپنی جگہ ایک چیز ہیں اور سائبیریا کے اچھوتے خودرو اور پراسرار جنگلات جن پر ابھی تک فطرت راج کرتی ہے بالکل دوسری چیز۔ میں نے ایک دفعہ ماسکو کے قریب کسی جنگل میں گھومتے ہوئے اپنے رہنما سے پوچھا تھا کہ اس جنگل میں کون سے جانور پائے جاتے ہیں ہے اس نے کہا خرگوش، گیدڑ یا لومڑی تو شاید کہیں نظر آجائے ورنہ یہاں اگر کوئی حیوان بستا ہے تو ان پتھروں کے مجسموں کی صورت میں ہے جو آپ کو جابجا نظر آتے ہیں۔ سائبیریا میں یہ صورت نہیں ہے، چنانچہ جس تپلی سی سڑک پر سے ہم ایک نیم ٹرک، نیم اسٹیشن ویگن قسم کی گاڑی میں بیٹھ کر ایرپورٹ سے براتسک کی طرف جا رہے تھے روشنی کی ایک ایسی کرن کے مانند تھی جو ہر جانب سے اندھیرے میں مقید ہو۔ البتہ براتسک کی کھلی بارونق جگمگاتی ہوئی بستی میں پہنچ کر یوں لگتا ہے کہ اس علاقے میں تاریکی کا کوئی وجود ہی نہیں لیکن اس قصبے سے ذرا باہر قدم رکھیے تو یہ تاثر بھی بالکل باطل ہو جاتا ہے۔

براتسک میں ہماری گاڑی مقامی انتظامیہ کے صدر دفتر کے سامنے جا کر رکی۔ دروازے پر ایک خوش لباس، خوبرو خاتون ہماری پذیرائی کو کھڑی تھیں، معلوم ہوا کہ یہاں کی انتظامیہ کی سربراہ وہی ہیں۔ ہمارے حساب سے یہاں کی ڈپٹی کمشنر سمجھ لیجیے۔ چائے کی میز پر ان سے باتیں شروع ہوئیں۔ خاندانی نام یاد نہیں البتہ ان کا اپنا نام لیڈیا تھا اور اندازے سے پینتیس چالیس کا سن ہوگا۔ براتسک کی کہانی لیڈیا کی زبانی الہ دین کے چراغ کی طرح کوئی الف لیلوی قصہ معلوم ہوتی تھی۔ ہمارے میر صاحب کی طرح لیڈیا بھی لینن گراڈ کی رہنے والی ہیں۔ وہاں کی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کر کے وکالت یا منصفی کے منصوبے باندھ رہی تھیں کہ براتسک کے پن بجلی گھر کا گرانڈیل منصوبہ مشتہر ہوا اور اس کے لئے سب علاقوں سے رضاکار طلب کیے گئے۔ لیڈیا بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ لیڈیا نے بتایا کہ جب یہ لوگ پہلے پہل اس مقام پر پہنچے تو یہاں چند دور افتادہ شکاریوں کے جھونپڑوں کے علاوہ کوئی آبادی نہیں تھی۔ نہ کوئی ریل گاڑی پہنچتی تھی نہ کوئی سڑک موجود تھی۔ جنگل کاٹ کر صرف ٹرک گزرنے کا کچا راستہ بنایا گیا تھا اور دریا کے کنارے کچھ زمین ہموار کر لی گئی تھی۔ پھر رضا کاروں کی یہ فوج یہاں پر پہنچی اور رہنے

کے لئے خیمے نصب کئے۔ مچھروں کی یلغار کی وجہ سے منہ یا ہاتھ پاؤں کھلے رکھ کر کام کرنا دشوار تھا۔ اس لئے سب لوگ چلتی پھرتی مچھر دانیاں معلوم ہوتے تھے۔ اسی حالت میں سب لوگ کام میں جت گئے۔ جنگل صاف کیا گیا، سڑکیں کوٹی گئیں، ریل کی پٹڑی بچھائی گئی، عمارتیں کھڑی کی گئیں، پھر بھاری مشینیں آئیں اور بجلی گھر کی تعمیر شروع ہوئی۔ کسان، صنعتی مزدور، دانشور، یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ نوجوان لڑکے لڑکیاں سب نے مل کر مشقت کی، کچھ ان سختیوں کی تاب نہ لاکر گھر لوٹ گئے، کچھ وہیں ڈھیر ہو گئے لیکن اکثریت نے ہمت نہیں ہاری اور اسے ذاتی چیلنج سمجھ کر اپنی اپنی ڈیوٹی پر ڈٹے رہے۔ آخر کار منصوبہ مکمل ہو۔ آرام دہ گھر، کلب، اسکول، ہسپتال، عمدہ سڑکیں اور گل و گلزار غرض کہ کوئی شہری آسائش ایسی نہیں جو لیڈیا اور اس کے ساتھیوں کو اب یہاں میسر نہ ہو۔

"خیر آپ لوگوں کے باقی کمالات سب تسلیم لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے مردوں کی نظر ذرا کمزور ہے" میں نے کہا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا ہے" لیڈیا ذرا تنک کر بولی۔

"مطلب یہ ہے کہ ایسی خوبصورت عورت سے کسی نے شادی کیوں نہیں کی ہے"

"یہ سوچنے کی تو فرصت ہی نہیں ملی"۔ لیڈیا کا رنگ سفید سے گلابی ہو گیا۔

پھر ہم بجلی گھر دیکھنے پہنچے، یہاں کس ڈول کے پہاڑ سے آبشار نیچے گرتے ہیں اور کیسی کیسی دیو ہیکل مشینیں کھڑی ہیں ان کا بیان تو الفاظ میں محال ہے، بس یوں سمجھ لیجئے کہ سائنس اکادمی میں چارٹ اور نقشے دیکھ کر جو ہیبت کا تاثر ذہن میں قائم ہوا تھا اس کا ایک مظہر اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب لیڈیا کے ایک نائب ہمارے پاس آئے اور کہا "یہ انسان اور مشین کا بنایا ہوا روشنیوں کا شہر تو آپ دیکھ چکے چلئے اب آپ کو یہاں کی کوئی اصل آبادی دکھلائیں۔"

ہم پھر اسی ٹرک نما میں سوار ہو کر قصبے سے نکلے اور جنگل میں کچے رستے پر ہو لئے۔ مطلع بالکل صاف تھا اور درختوں کی چوٹیوں پر دھوپ کا سنہری رنگ دور سے دکھائی دے رہا تھا لیکن نیچے

درختوں کی دیوار تلے قریب قریب تاریکی تھی اور ہماری ٹرک کی گھڑ گھڑ اور کیڑوں مکوڑوں کی بھنبھناہٹ کے سوا مکمل سناٹا تھا، کچھ دور جا کر لکڑی کے یک منزلہ گھروں کی ایک قطار دکھائی دی۔

"یہ اس علاقے کا بہت پرانا گاؤں ہے" ہمارے رہنما نے بتایا۔

گاؤں کیا تھا مشکل سے بیس تیس گھر ہوں گے لیکن اس کی واحد سڑک پر پتھروں کا پکا فرش تھا اور کنارے کنارے بجلی کے کھمبے استادہ تھے۔ ہم پہلے یا دوسرے گھر کے سامنے رکے، دروازہ کھٹکھٹایا اور اندر سے ٹالسٹائے یا گورکی کا ایک بنا بنایا کردار برآمد ہوا۔ کشیدہ قد، پکا رنگ، لانبی ڈھلکی ہوئی مونچھیں، دہری چھاتی اور بازو معلوم ہوتا تھا گوشت کے نہیں کسی دھات کے بنے ہوئے ہیں۔ یہ کوئی پیشہ ور شکاری صاحب تھے۔ بہت خندہ پیشانی سے ہماری آؤ بھگت کی اور گھر میں لے گئے۔ ڈیوڑھی نما جگہ میں ایک نوجوان ریڈیو سٹ سے کچھ کھٹ پٹ کر رہے تھے۔ ان سے تعارف ہوا یہ شکاری صاحب کے صاحبزادے تھے۔ ایک کمرے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی ایک نوجوان خاتون برآمد ہوئیں جو گھر کی بہو تھیں، گھر میں تین کمرے تھے اور ایک باورچی خانہ جو کھانے اور بیٹھنے کے استعمال میں بھی آتا تھا۔ یک کمرہ نیم گودام اور نیم اسلحہ خانہ تھا۔ کھانے پینے کا سامان، رائفلیں، پیش قبض، پوستینیں، بڑھئی کے اوزار اور کچھ متفرق چیزیں رکھی تھیں۔ ایک کمرہ شکاری کا تھا اور ایک نوجوان جوڑے کا۔ سادہ اور مختصر فرنیچر لیکن خوش وضع اور مضبوط۔ سارا گھر آئینے کی طرح صاف تھا اور باورچی خانے میں۔ سٹوو پر جو کچھ پک رہا تھا اس کے علاوہ سب برتن معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی مانجھ کر رکھے ہیں۔ جیسا کہ سوویٹ یونین میں قریب قریب ہر جگہ دستور ہے تھوڑی ہی دیر میں ناخواندہ مہمانوں کے لئے میز پر دستر خوان بچھا اور صحیح معنوں میں "ماحضر" چن دیا گیا۔ دو تین طرح کا سوکھا گوشت، دو تین طرح کی روٹی، پنیر، شیرینی اور قہوہ۔ پھر شکاری صاحب نے اپنی حکایت شروع کی اور بتایا کہ اگلے وقتوں میں جو لوگ تعزیر کے لئے سائبیریا بھیجے جاتے تھے ان میں سے کچھ یہیں بس جاتے تھے اس لئے کہ یہاں کے پہاڑ، بن اور جھیلیں کسی رئیس کی جاگیر نہیں تھیں۔ نہ یہاں رہ کر کسی آقا کا طوق غلامی گلے کا ہار ہوتا تھا۔ یہاں تو صرف فطرت کی بادشاہت تھی۔ یہاں تو صرف اپنے دست و بازو اور دل و جگر کی آزمائش تھی اور جو کوئی اس

میں پورا اترتا یہاں آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن اب وہ اگلے وقتوں کی سی سختیاں کہاں۔ اب تو یہاں سڑک بھی موجود ہے، ہر گھر میں بجلی ہے، پانی ہے، گھر بیٹھے ریڈیو پر دنیا بھر کی خبریں سن سکتے ہیں، ڈاک بھی پہنچتی ہے، دو میل پر شہر آباد ہے جہاں ڈاکٹر بھی موجود ہے، دوائی بھی، وہاں کلب میں تفریح کا سامان بھی ہے اور اسٹور میں دنیا بھر کی نعمتیں بھی موجود۔ ہماری جوانی کے دنوں میں یہ سب کچھ کہاں تھا، اب اتنے انسان یہاں آبسے ہیں تو یہاں کے اصلی باشندے بھالو، بھیڑیے، لکڑبگھڑ دور جا چھپے ہیں پہلے وہ یہاں ہماری تلاش میں آیا کرتے تھے اب ہمیں ان کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔ ایک بھالو سے ابھی تھوڑے ہی دن پہلے ملاقات ہوئی تھی جس کی نشانی آپ ساتھ لیتے جائیں۔ یہ کہہ کر اٹھے اور اندر سے ایک بھورے ریچھ کا ہولناک کٹا ہوا پنجہ لا کر ہمارے حوالے کیا۔ پھر کہنے لگے "میں نے تو بچپن میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی، پڑھنے لکھنے کا اس ویرانے میں کیا سوال تھا لیکن اب ان بچوں کو دیکھو جو آج کل چھٹی گزارنے میرے پاس آئے ہیں، لڑکا انجینئرنگ کے کورس کے آخری سال میں ہے اور اس کی دلہن ڈاکٹری کر رہی ہے۔ نہ جانے کس دن براتسک کی طرح یہاں پر بھی کوئی قصبہ کھڑا ہو جائے گا اور یہ رفلیں وفلیں سب بیکار ہو جائیں گی۔ ان کے لہجے میں کچھ فخر بھی تھا اور کچھ تاسف بھی۔

واپسی پر جھٹپٹا ہو چکا تھا، ایک جگہ پل بھر کو ہماری گاڑی ایک دلدل میں ذرا اٹکی تو ڈرائیور نے آواز دی کسی کھڑکی کا شیشہ کھلا ہو تو جلدی سے چڑھا لیجیے۔ میری ہی طرف کا شیشہ کھلا تھا۔ میں نے چڑھا تو لیا لیکن اس سے پہلے مچھروں کی ایک پوری بوچھاڑ ہم پر پڑی جس سے ہم اپنی منزل تک برسر پیکار رہے۔

شام کو کلب میں ضیافت کے ساتھ رقص و موسیقی کا اہتمام تھا۔ گانے بجانے والے سب بجلی گھر میں کام کرنے والے شوقیہ فن کار تھے۔ لڑکیاں، لڑکے، بڈھے، جوان، کوئی ساز کا ماہر تھا کوئی آواز کا۔ ایک دو لڑکیاں رقص میں تربیت یافتہ تھیں، باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ ہماری میزبان لیڈیا کو شعر و ادب سے بھی بہت لگاؤ ہے۔ چنانچہ ہم سے شعر سنانے کی فرمائش ہوئی۔ میری مترجم نے دوراندیشی سے روسی زبان میں ترجمے کی ایک کتاب ساتھ رکھ لی تھی، اس نے ترجمہ پڑھ کر سنایا اور پھر لیڈیا کے اصرار پر یہ کتاب انہی کو پیش کر دی گئی۔

یہ تجربہ سوویٹ یونین میں بار بار ہوا ہے کوئی صاحبہ یا صاحب کام کچھ کرتے ہیں لیکن شوق کوئی اور پال رکھا ہے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میں اور سوویٹ ادیبوں کی انجمن کی کارکن مریم سلگانیک ٹیکسی میں ماسکو کے شہرۂ آفاق ریڈ اسکویر یعنی سرخ چوک سے گزر رہے تھے۔ اس زمانے میں ٹالسٹائے کے ناول امن اور جنگ کی فلم بن رہی تھی اور اسکویر کے وسط میں اس فلم کا ایک سیٹ لگا ہوا تھا۔

"جانتے ہو یہ کیا سین فلمایا جارہا ہے" ٹیکسی ڈرائیور نے ہم سے پوچھا۔

"نہیں تو"

"یہ بورودینو کی لڑائی میں ہماری فوجی ہائی کمان کا کیمپ ہے، تمہیں معلوم ہے کہ اس لڑائی میں ہمارے توپ خانے اور رسالے کی صحیح گنتی کیا تھی اور میدانِ جنگ کا صحیح رقبہ کیا تھا۔"

"ہمیں تو نہیں معلوم لیکن تمہیں کیسے معلوم ہے" مریم نے جواب دیا۔

"مجھے ایسے معلوم ہے کہ میں دو تین برس سے اس لڑائی کی تفاصیل پر تحقیق کر رہا ہوں۔"

"لیکن یہ کس سلسلے میں"

"بس ایسے ہی۔ مجھے یہ شوق جب سے ہے جب میں نے ٹالسٹائے کی کتاب پہلے پہل پڑھی اور اس لڑائی کا پورا نقشہ میری نظر میں گھوم گیا۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ نہ جانے اس لڑائی کا اصل میں نقشہ کیا تھا۔ اگر اس کی تفصیل معلوم ہو جائے تو پتہ چلے کہ میں نے اپنے ذہن میں جو نقشہ بنایا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ تو میں جب سے اس لڑائی کے بارے میں مطالعہ کر رہا ہوں۔"

خیر یہ تو ایک لمبا جملہ معترضہ بیچ میں آگیا۔ براتسک کے بعد ہم بیکال کی جھیل دیکھنے پہنچے۔ سائبیریا کے مناظر فطرت میں عام قد کاٹھ یعنی نارمل سائز کی شاید ہی کوئی مثال ملے، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فطرت نے ہر شے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ یہی صورت جھیل بیکال کی ہے۔ ہم لوگ جھیل کا تصور کرتے ہیں تو کشمیر کی حسین و جمیل جھیل ڈل کا منظر ذہن میں ابھرتا ہے یا اب سندھ کی کلری یا منچھر جھیل کا نقشہ سامنے آتا ہے لیکن بیکال کے مقابلے میں ڈل کو رکھیے تو ڈل جھیل نہیں چلو بھر پانی نظر آئے گی۔ البتہ بیکال سے ہزاروں میل دور ہم نے ایک اور جھیل ضرور دیکھی ہے جسے ڈل کا بدل کہتے ہیں۔

بہت دن ہوئے میں اور ہماری بیٹی سلیمہ بحر اسود کے کنارے ایک صحت افزا مقام سوچی میں کچھ عرصے کے لیے ٹھہرے تھے جہاں گرمیوں کے موسم میں علاج معالجہ یا سیر و تفریح کے لیے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ اس قیام کی بہت سی دلکش یادوں میں اسی خوب صورت جھیل رتزا کی یاد بھی شامل ہے جو اسی علاقے میں واقع ہے۔ اونچی اونچی سبز پوش پہاڑیوں میں گھرا ہوا آئینے کی طرح شفاف نیلگوں ٹھہرا ہوا تختۂ آب جس کے کنارے کنارے بید مجنوں اور شمشاد کے درخت جھومتے ہیں اور رنگا رنگ کے پھول لہلہاتے ہیں۔ پانی میں چھوٹے چھوٹے رنگین بجرے رواں ہیں اور کنارے سے ذرا ہٹ کر لال نیلی پیلی چھتوں والی ایک منزلہ آرام گاہیں ہیں، بالکل ڈل کا سا منظر ہے اور یوں لگتا ہے کہ ڈل کی طرح یہ جگہ بھی نصرت کی تخلیق نہیں ہے کسی مصور کا شاہکار ہے جس نے رنگ اور کینوس کے بجائے پانی اور پھول بوٹوں سے کام لے کر یہ تصویر بنائی ہے اور پھر اسے ان پہاڑوں کے بیچوں بیچ آویزاں کر دیا ہے۔ اسی جھیل کے کنارے ذرا بلندی پر اسٹالن صاحب کی آرامگاہ تھی اور سنا ہے کہ ان کا بہت سا وقت یہیں پر گزرتا تھا، یہ کوئی بہت بڑی عمارت تو نہیں ہے لیکن کریملن میں لینن کی درویشانہ ڈھائی کمروں پر مشتمل سکونت گاہ کے مقابلے میں اس کافی مکلف اور مرصع ایوان کو محل ہی سمجھنا چاہیے۔ سوچی کی اور یادوں میں ہمارے دور کے عظیم شاعر، مفکر اور مجاہد پابلو نرودا سے پہلی ملاقات بھی شامل ہے، پابلو نرودا ان کی بیگم اور ہم ایک ہی سینی ٹوریم میں ٹھہرے تھے اور دس پندرہ دن ان سے قریب قریب ہر روز صحبت رہی۔ دراز قد، دہرا بدن، گندمی رنگ، ذرا موٹے نقش، بڑی بڑی سنجیدہ اور کچھ متفکر سی آنکھیں، پہلی ملاقات میں نرودا مجھے بہت ہی بارعب، باوقار اور قدرے خاموش شخصیت دکھائی دیے۔ ان کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کا اندازہ بعد میں ہوا۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے جب افریقہ کے بیشتر ملک آزاد ہو چکے تھے، کیوبا میں انقلاب کی جیت ہو چکی تھی اور ویت نام میں امریکنوں کی چیرہ دستیوں کے باوجود انقلابی فوجوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا چنانچہ نرودا لاطینی امریکہ اور خاص طور سے چلی کے مستقبل کے بارے میں بہت پُر امید تھے۔ انہیں اپنے وطن کے علاوہ سب سے زیادہ شغف لاطینی امریکہ کی قدیم تہذیبوں سے تھا جو مختلف حملہ آوروں کی دستبرد نے ملیامیٹ کر دی تھیں۔ انہی کے نوادرات

کا ذخیرہ جو نرودا اپنے گھر میں جمع کر رہے تھے، ان کا سرمایۂ حیات تھا۔ جب اس سرمائے اور پابلو نرودا کی بے بہا جان سے چلی کے فوجی درندوں نے شب خون مارا تو لاطینی امریکہ کی تہذیب کا چراغ ایک بار پھر گل ہو گیا۔

پابلو نرودا کی باغ و بہار صحبت میں اس المیہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "بھئی اس سینی ٹوریم کے پرہیزی کھانے سے ناک میں دم آ گیا ہے، ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے، تمہیں نیا نیا لینن انعام ملا ہے آج میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ میری طرف سے تمہارے شایانِ شان ایک دعوت ہونی چاہیئے، پھر تو لازم ہے کہ تم جواباً میری دعوت کرو، پھر ہم عزیز شریف سے کہیں گے کہ وہ ہم دونوں کی دعوت کرے پھر ہم دونوں عزیز شریف کی دعوت کریں گے۔"

سوچی میں ایک اور دلچسپ جگہ گلزارِ دوستی ہے، اس باغ میں پھلدار درختوں سے عجیب عجیب تجربے کیے گئے ہیں۔ مثلاً کسی پیڑ کی ایک شاخ پر لیموں لگے ہیں تو دوسری شاخ پر مالٹے اور تیسری پر نارنگیاں، ایک ڈالی خوبانیوں سے جھوم رہی ہو تو دوسری پر ناشپاتیاں لٹک رہی ہیں، اس کے نام کی وجہ یہ ہے کہ ہر شاخ پر کسی نہ کسی باہر سے آنے والے مہمان کا نام لکھا ہے جس نے اس شاخ کو پیوند کیا تھا۔ اور اس شاخ کے پھل پر کم از کم خیالی طور پر اسی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں ہمیں کئی بہت معروف نام نظر آئے۔ چارلی چپلن، پکاسو، پال روبسن وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ایک شاخ ہماری بھی ملکیت قرار پائی اور طرفہ بات یہ ہے کہ باغبان صاحب خود بھی ایک رنگین مزاج شاعر تھے اور ایک نظم آپ نے وہیں فی البدیہہ موزوں کر کے ہمارے حوالے کی۔

بات کہیں کی کہیں نکل گئی، ذکر بیکال کا ہو رہا تھا، جھیل کی سیر سے پہلے ہم وہاں سے ذرا فاصلے پر ینگ پائنیرز کیمپ یا بچوں کا تفریحی مرکز دیکھنے گئے۔ ان مراکز کو یوں تو کیمپ کہا جاتا ہے اور "کیمپ" سے ہمیں فوراً تنبو، قنات کا خیال آتا ہے لیکن اس کیمپ میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی، ایک وسیع و

---

(۱) عزیز شریف عراقی امن کمیٹی کے سربراہ اور اب عراقی حکومت کے رکن ہیں۔

عریض مرغزار میں چند دیدہ زیب عمارتیں تھیں۔ کھیل کے میدان تھے، نہانے کے تالاب جھولے، جمناسٹک کے جھولے، تھیٹر ہال، کھیلے میں ایک اسٹیج اور ایسا ہی اور ساز و سامان تھا۔ قریب قریب ہر علاقے میں صحت افزا مقامات پر ایسے کیمپ بنائے گئے ہیں جہاں ہر شہر کے بچے گرما کی چھٹی گزارنے آتے ہیں۔ یہاں ان کی سیر، تفریح، کھیل کود، پڑھائی لکھائی، حفظانِ صحت وغیرہ کا جملہ سامان بہم کیا جاتا ہے۔ تبدیلیٔ آب و ہوا کے علاوہ ان کیمپوں میں بچے ایک تو اپنے وسیع و عریض ملک کے مختلف علاقوں سے واقف ہو جاتے ہیں پھر مختلف شہروں اور مختلف قومیتوں کے بچوں کا آپس میں میل ملاپ بجائے خود قومی یکجہتی اور قومی مفاہمت کا بہت مؤثر وسیلہ ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ بچوں کی چھٹی کے ساتھ مہینے دو مہینے کے لئے ان کے والدین کو بھی بچوں کی دیکھ بھال سے چھٹی مل جاتی ہے اور وہ بھی اس دوران میں دلجمعی سے سیر و تفریح کر سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں ہمارے ہاں اور غالباً دوسرے ملکوں میں بھی سوویٹ یونین کے بارے میں اور تہمتوں کے علاوہ، ایک یہ بات بھی پھیلائی گئی تھی کہ یہاں بچے بچپن ہی میں والدین سے جدا کر دیئے جاتے ہیں اور سب کو سرکاری ہاسٹلوں میں رکھا جاتا ہے جہاں انہیں مار پیٹ کر کمیونسٹ بنایا جاتا ہے۔ اب تو یہ بات شاید مذاق معلوم ہو لیکن اس زمانے میں اچھے خاصے معقول لوگ بھی اسے سچ سمجھتے تھے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ کسی بقراط کے کان میں انہیں پائنیر کیمپس کی بھنک پڑی ہوگی جس کا ان حضرات نے یہ بتنگڑ بنا دیا ہوگا اور اگر یہ صاحب کبھی موسمِ گرما کے آغاز میں ماسکو تشریف لاتے جب بچوں کے قافلے ان کیمپوں کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو یقیناً اس منظر سے ان کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ میں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ بسوں کی قطار لگی ہے جن پر سرخ پھریرے لہرا رہے ہیں، بسوں کے اندر گاتے بجاتے بچوں کے گلے میں سرخ رومال پڑے ہیں، بالکل یوں لگتا ہے کہ شہر کی مختلف سڑکوں پر گلِ لالہ کی روش بچھ گئی ہے۔ یہاں حکومت کے وزیروں یا بڑے سے بڑے عہدہ دار کے لئے ٹریفک بند نہیں ہوتا لیکن بچوں کا قافلہ نکلتا ہے تو عام طور سے باقی ٹریفک روک دیا جاتا ہے چنانچہ اس معاشرے میں اگر کوئی طبقہ وی آئی پی کہلا سکتا ہے تو وہ بچوں ہی کی مخلوق ہے۔

تو خیر ہم نے اس کیمپ کی مختلف سرگرمیاں دیکھیں، یہاں بچے کھیلتے ہیں، تیرتے ہیں، ڈرامہ کرتے

ہیں، تصویریں بناتے ہیں، یہاں مختلف دستکاریوں میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں اور کس کس نہج سے انہیں اپنی روزمرہ زندگی میں آزادی اور نظم وضبط کا بیک وقت سبق دیا جاتا ہے۔ لیکن بچے تو آخر بچے ہیں۔ ہم ایک روش سے گزر رہے تھے کہ ایک بچی دور سے دوڑتی ہوئی آئی اور ہمارے مترجم صاحب سے لپٹ کر بھائیں بھائیں رونے لگی۔ انہی کی بچی تھی۔ آخر میں بچے کھلے اسٹیج کے سامنے جمع ہوئے۔ ایک بچے نے ہمیں سرخ رومال اور اپنے کیمپ کا بیج پیش کیا، ایک دو بچوں نے تقریریں کیں اور آخر میں سب نے مل کر اپنا بہت ہی میٹھا اور دلکش گانا گایا۔

یہ آسماں سلامت رہے
یہ سورج چمکتا رہے
یہ چاند تارے سلامت رہیں،
میرا وطن سلامت رہے،
میں سلامت رہوں،
میری ماں زندہ رہے،

سورج ڈھل رہا تھا جب ہم لانچ میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کو روانہ ہوئے۔ ایک جانب جنگلوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور سامنے تاحدِ نظر ایک بحرِ ذخار جو بیکال جھیل ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گہری قدرتی جھیل ہے جس کی ایک منفرد بات تو یہ ہے کہ ایسا شفاف پانی اور کہیں نہیں پایا جاتا اور دوسری یہ کہ اور بہت سے قدرتی ذخائر کے علاوہ یہاں بعض مچھلیاں اور آبی جانور ایسے پائے جاتے ہیں جن کا دنیا میں اور کہیں وجود نہیں۔ اس جھیل پر غروب آفتاب کا نظارہ دیکھنے کی چیز ہے جب دور تک پھیلا ہوا پانی عنابی ہو جاتا ہے اور سبز پہاڑ خابند ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک پہاڑی کی ڈھلوان سے آوازیں آنی شروع ہوئیں، دیکھا کہ کچھ نوجوان لڑکے لڑکیاں جمع ہیں اور ہاتھ ہلا کر ہمیں بلا رہے ہیں۔ ہم نے لانچ کنارے لگائی اور یہ لوگ چوکڑیاں بھرتے ہوئے نیچے اتر آئے۔ یہ بھی مختلف علاقوں سے آئے ہوئے طالبات اور طلبا تھے۔ آپس میں تعارف

ہوا اور ان بچوں نے اصرار کیا کہ ہم ان کے ساتھ پک نک میں شریک ہوں۔ ہم چڑھائی چڑھنے کے دشمن ہیں لیکن یہ بچے کشاں کشاں ہمیں اوپر لے گئے۔ ایک آدھ جگہ پہلے سے آگ جل رہی تھی اور اوپر کیتلیاں چڑھی تھیں۔ اب لڑکیوں نے جلدی جلدی سوکھی لکڑیاں جمع کر کے دو تین اور چولہے چڑھا دیئے۔ ان کے نوجوان استاد بھی کام میں ساتھ ہو لئے' چائے تیار ہوئی' پکوان پکے' بہت سی باتیں ہوئیں۔ خاص طور سے پاکستان کے بارے میں انہیں معلومات حاصل کرنے کی بہت طلب تھی۔ بہت گانے گائے گئے' کچھ لڑکیاں مہمانوں کے لئے جنگلی پھولوں کے ہار بنا لائیں اور دیر تک محفل گرم رہی۔ آجکل دنیا میں جنریشن گیپ کا بہت قصہ رہتا ہے۔ ہمارے مشرقی ملکوں میں تو یوں بھی بڑوں چھوٹوں کے درمیان تکلفات کے اتنے پردے حائل ہیں کہ آپس میں کھل کر کم ہی بات ہوتی ہے اور اگر اجنبی لوگوں کی ملاقات ہو تو ظاہر ہے کہ یہ فاصلہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہاں عمر کا ادب اور لحاظ تو بہت ہے اور ظاہر ہے کہ جذباتی اور ذہنی فرق بھی ہوگا لیکن یہ باتیں بے تکلف میل ملاپ کے آڑے نہیں آتیں اور چھوٹے بڑے اکثر بالکل ساتھیوں کی طرح گپ اڑاتے رہتے ہیں۔

شام ہونے کو آئی تو محفل برخاست ہوئی اور ہم سب دو کشتیوں میں بٹ کر واپس لوٹے اور لڑکے لڑکیوں نے مل کر پیر توشنگو کا گیت الاپنا شروع کیا۔

"کیا ہم روسی جنگ طلب ہیں ؟
جاؤ میرے دیس سے پوچھو' پھر پوچھو اک بار
اس منوم فضا سے پوچھو' اس خاموش ہوا سے پوچھو'
جس میں جھول رہے ہیں پیڑ' دیوار اور چنار'
ان کے نیچے کام آتے تھے بانکے کئی ہزار
ان کی جگہ اب ان کے بچے'
پل کر ہیں تیار'
پہلے سے بھی جانتے ہو' اب جان لو پھر اک بار
کیا ہم روسی جنگ طلب ہیں ؟"

داغستان

بچپن کا کیا مذکور ہے اب بھی بے خیالی میں کوہ قاف کا نام لیجیے تو مشکل سے باور آتا ہے کہ ایسا کوئی علاقہ واقعی کہیں موجود ہے جہاں جن پریاں نہیں ہم جیسے انسان بستے ہیں۔ اب بھی گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی جغرافیائی خطہ نہیں محض خواب و خیال کی سرزمین ہے یوں سنی ضرور ہے دیکھی کسی نے نہیں۔ بچپن اور نوجوانی میں ایسے ہی کچھ اور نام بھی سنے تھے۔ دور دراز اور پر اسرار۔ انہی میں داغستان بھی شامل ہے اور کیوں نہ ہو آخر یہ کوہ قاف کا ایک گوشہ ہی تو ہے اگرچہ اس کے تصور میں جن پری کا دخل کم ہے اور سرفروش تیغ زنوں، برق رفتار گھوڑوں، نڈر طالع آزماؤں کا زیادہ۔ چنانچہ جب داغستان کے ادیبوں کی انجمن نے ایک تقریب میں ہمیں یاد کیا تو "ہوس سیر و تماشا" کی کمی کے باوجود رختِ سفر باندھنے میں ایک گونہ مسرت محسوس ہوئی۔

ہمارا چھوٹا سا ڈکوٹا قسم کا جہاز داغستان کے صدر مقام مہاچ قلعہ کے کچے ہوائی میدان میں اترا۔ مہمان ہوائی جہاز سے نکلے، داغستان کے ملک الشعرا جو روسی تلفظ کے لحاظ سے رسول غمزتوف اور لغت کے اعتبار سے رسول حمزہ ہیں پذیرائی کو آگے لپکے ملے اور میزبانوں سے ہمارا تعارف کروایا۔

"یہ جمہوریہ داغستان کی صدر ہیں بیگم عبدالبصیر۔" ہلکے نسواری کے کوٹ اور اسکرٹ میں ملبوس ایک خاتون آگے بڑھیں، بظاہر تیس پینتیس کا سن ہوگا۔ کھلتا ہوا رنگ، باریک نقش، سیاہ بالوں میں ہلکی سی سرخی کی جھلک، سنہری فریم کا چشمہ لگائے، اگر لباس ذرا مختلف ہوتا تو ان پر اپنے ہاں لاہور یا کراچی کی کوئی پروفیسر یا ڈاکٹر ہونے کا شبہ ہو سکتا تھا۔ داغستان کی محفلوں میں ان کی شخصیت ہمیشہ

الگ تھلگ دکھائی دیتی رہی۔ یہاں کے لوگ بہت کھاتے ہیں، بہت پیتے ہیں، بہت ہنگامہ کرتے ہیں لیکن بیگم عبدالبصیر ہمیشہ متین، کم گو، اور کم آمیز نظر آئیں۔ بہت ہوا تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی اور بس۔

ان کے بعد اور لوگوں سے تعارف ہوا، عبدالرحمان دانیال، عبداللہ خان، حبیب اللہ، محمد یعقوب، عبدالوہاب اور کچھ اور بزرگ۔ یہ سیاسی قائد ہیں، یہ یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ یہ پلاننگ کی قومی تنظیم کے سربراہ ہیں، ڈاکٹر ہیں، یہ بڑے انجینئر ہیں وغیرہ وغیرہ اور مجھے معاً خیال آیا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے جب یہ لوگ کم عمر ہوں گے تو ان کے والدین نے ان کے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔ یقیناً ان میں سے کسی کو فوج میں سپاہی بھرتی کرنے کا سوچا ہوگا، کسی کو کھیتی باڑی میں شریک کرنے کی فکر ہوگی، زیادہ سے زیادہ کسی کو مکتب میں بٹھا کر ملّا یا مدرّس بنانے کا خیال کیا ہوگا، پر فیسر اور ڈاکٹری اور انجینئری تو کسی کے خواب دخیال میں بھی نہ آئی ہوگی۔

پھر ہم ایک تپلی سی سڑک پر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ سڑک کی حالت بہت اچھی نہیں تھی، کئی بار ڈرائیور کو جھٹکے سے گاڑی ادھر ادھر موڑنا پڑی۔ "بھئی موٹر کے اس بھنگڑا ناچ کو معاف کر دینا" رسول حمزہ نے ہنستے ہوئے کہا "بات یوں ہے کہ اس سڑک پر اکثر سمندر کا پانی آجاتا ہے اور بیگم بصیروا کی کوشش کے باوجود جگہ جگہ گڑھے پڑ جاتے ہیں"۔ سڑک سے ذرا فاصلے پر کیسپین سمندر کا پانی جھیل کی طرح ساکن تھا۔ مہاچ قلعہ کے گرداگرد پہاڑوں پر شام کی نیلاہٹ چھا چکی تھی، دائیں جانب بہت دور ایک چوٹی کے کنارے کاسنی بادلوں میں گھرا ہوا قرمزی سورج دھیرے دھیرے ڈوب رہا تھا۔ کسی نے منظر کی تعریف کی تو رسول حمزہ نے کہا "اس منظر پر مت جاؤ دوستو، ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے، یہ جگہ اصل داغستان نہیں ہے، اصل داغستان تو ان پہاڑوں کے ادھر ہے، جہاں میرا گاؤں ہے۔ اصل داغستان کا نظارہ تمہیں وہاں سے دکھائیں گے"۔

رسول حمزہ صرف داغستان کے ملک الشعراء ہی نہیں ہیں بلکہ ان کا کلام سوویٹ یونین کے ہر علاقے میں یکساں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ وہ سوویٹ پارلیمنٹ کی مجلس صدارت کے رکن یعنی ایک طریقے سے

سوویٹ یونین کے نائب صدر بھی ہیں۔ ان کے اشعار کا ترجمہ تو یہاں کی بیسیوں زبانوں میں ہو چکا ہے لیکن یہ شعر اپنی مقامی بولی آوار میں کہتے ہیں۔ داغستان کی آبادی تو دس لاکھ سے ذرا اوپر ہے لیکن یہاں سب ملا کر چھتیس چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں، آوار، لزگن، درگن، آذربائیجانی، کومیک وغیرہ۔ باقی ان کی مختلف مقامی صورتیں ہیں۔ ان زبانوں کا شجرۂ نسب چار خانوادوں سے ملتا ہے۔ قفقازی، تاتاری، ترکی اور فارسی۔ ان کی اصوات اور مخرجات عربی سے مشابہ ہیں۔ کئی صدیوں سے لے کر ماضی قریب تک یہاں کی مشترکہ زبان عربی تھی اور مقامی زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ غالباً اسی وجہ سے ان میں کی کوئی بولی ترقی کر کے باقی سب پر غلبہ نہ پا سکی۔ یہاں لطیفہ مشہور ہے کہ جب قسّامِ ازل کے حضور مختلف قوموں میں مختلف زبانیں بٹنے لگیں تو عربوں کو عربی، عجمیوں کو فارسی اور ترکی، انگریزوں کو انگریزی مل گئی اور جب سب قوموں کی گنتی ختم ہو گئی تو کچھ زبانیں بچ رہیں، حکم ہوا کہ ان سب کو ایک طرف پھینک دو اور یہ سب داغستان میں آ گریں۔

تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک داغستان کی سرزمین پر ہر جانب سے یلغار ہوتی رہی، ہن، ارمنی، گرجستانی، آذربائیجانی، ایرانی، عرب، مغول، ترک، روسی، یوکرانی وغیرہ، کوئی فاتح بن کر آیا، کوئی پناہ گیر ہو کر۔ اس کے پہاڑوں اور وادیوں میں ان گنت لڑائیاں لڑی گئیں جن میں ہن، اور ایرانی، عرب اور تتار، روسی اور ترک صدیوں تک نبرد آزمائی کرتے رہے۔ چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں داغستان اور شمالی آذربائیجان کی مشترکہ سلطنت سارے قفقاز کی تجارتی منڈی تھی اور ایشیا اور جنوب مشرقی یورپ کی تجارتی شاہراہوں کا بہت اہم مرکز۔ پانچویں صدی میں اس سلطنت کا شمالی حصہ ایرانیوں نے فتح کر لیا اور داغستان کے سب سے مشہور اور قدیم شہر دربند کی بنا ڈالی۔ لیکن ایرانی اس پورے علاقے کو مطیع نہ کر سکے اور ساسانیوں کے زوال کے بعد یہاں کے قبائل پھر خود مختار ہو گئے۔ تاریخ کے اگلے دور میں کوئی تین سو برس تک یہاں عربوں کی حکومت رہی جس کے نقوش اہلِ داغستان کے مذہب یعنی اسلام، ان کے لب و لہجے اور آدابِ اخلاق سے اب تک عیاں ہیں۔ خلافتِ عباسیہ کا چراغ گل ہوا تو یہ بساط بھی الٹ گئی اور چودھویں صدی میں امیر تیمور نے

داغستان پر لشکر کشی کی جو یہاں کے کوہ و دمن کا سب سے خونچکاں باب ہے۔ کہتے ہیں کہ امیر تیمور نے یہیں پر بریدہ سروں کے مینار بنائے اور سر بریدہ لاشوں کے انبار لگائے تھے۔ داغستان کے بہت سے پرانے عوامی گیت، جنگ نامے، اور قومی سرفروشوں کے قصے کہانیاں اسی دور سے متعلق ہیں۔

سولھویں صدی میں روسیوں نے قفقاز کی طرف پیش قدمی شروع کی اور اس صدی کے وسط میں قازان اور استراخان پر قبضہ کر کے دولت تاتار کی کمر توڑ دی۔ لیکن اس سرزمین پر روسیوں کے قدم جمنے نہ پائے تھے کہ ایشیائے کوچک کی ترک فوجوں کا ہلالی پرچم مشرق و مغرب میں لہرانے لگا اور ۱۵۷۸ء میں یہ فوجیں گرجستان اور آذربائیجان کو زیر کر کے داغستان میں داخل ہوئیں۔ داغستان کے قبائلی سردار دو ٹولیوں میں بٹ گئے کچھ ترکوں کے مطیع ہو گئے اور کچھ روسیوں سے نباہتے رہے۔ رسول جدال و قتال کا بازار گرم رہا اور آخر ۱۷۲۲ء میں امیر امام قلی خان نے دارالحکومت دربند کی چابیاں زار روس پیٹر اعظم کے حوالے کر دیں۔ ترکوں اور روسیوں کے معرکے ختم نہ ہو پائے تھے کہ ایران میں نادر شاہ نے بھاری فوجی جمعیت منظم کی اور شمال و جنوب سے حملہ کر کے داغستان کا بیشتر علاقہ فتح کر لیا، اگلی نصف صدی میں یہ چھوٹا سا ملک تین بڑی قوتوں یعنی ترکی، روس و ایران کے درمیان میدانِ جنگ بنا رہا اور پھر انیسویں صدی کے شروع میں بارہ سال مسلسل خونریزی کے بعد ایران اور روس میں معاہدۂ گلستان طے پایا جس کی رو سے داغستان، گرجستان اور شمالی آذربائیجان مستقل طور سے زار روس کی قلمرو میں آ گئے اگرچہ ان علاقوں میں داخلی خودمختاری کی کوئی نہ کوئی صورت قائم رہی۔

داغستان کا رقبہ اکتیس ہزار مربع میل ہے اور جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں یہاں کی آبادی دس لاکھ باسٹھ ہزار تھی۔ شمال مشرقی قفقاز میں اس کی سرحد ایک جانب گرجستان، اور دوسری سمت آذربائیجان سے متصل ہے۔ قدرت نے اس خطے کے دشت و دمن، بحر و بر حتیٰ کہ اس کے دشت و صحرا میں بھی اپنے خزانے دونوں ہاتھوں سے لٹائے ہیں۔ پہاڑوں میں کوئلے، لوہے، گندھک اور جپسم کے ذخیرے ہیں۔ میدانوں میں تیل کے فوارے چھوٹتے ہیں، اور زیر زمین قدرتی گیس کا دفینہ ہے۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے۔ چاول، گندم، مکئی، پھل، ترکاریاں ہر نوع کی فصل کاشت ہوتی ہے۔

یہاں گرم پانی کے صحت بخش چشمے ہیں، اخروٹ، سفیدے اور شاہ بلوط کے بن، خوبانی، سیب، انگور اور شہتوت کے باغات ہیں۔ زرگری، ظروف سازی، قالین بافی اور شیشہ گری کی قدیم دستکاریاں ہیں اور فولاد، مشینی آلات اور کیمیاوی مفردات اور مرکبات کے جدید کارخانے ہیں۔ انقلاب سے پہلے ان میں سے بہت سے خزائن سربمہر رکھے تھے لیکن اب جمہوریہ داغستان کا شمار سوویٹ یونین کے اہم صنعتی علاقوں میں ہوتا ہے۔

یہ تمہید ذرا لمبی ہوگئی لیکن جیسا میں نے ابتدا میں ذکر کیا تھا اس علاقے کے بارے میں ہماری معلومات اتنی کم ہیں کہ ان چند بنیادی حقائق کا ذکر ضروری تھا۔ رسول حمزہ کی بات ہو رہی تھی جنہیں اسی زمانے میں ادبی خدمات کے اعتراف میں لینن انعام ملا تھا۔ یہ اعزاز سوویٹ یونین میں صرف گنتی کے چند اشخاص کو حاصل ہے جن میں دو تین ادیب ہیں، ایک عمارت گر اور ایک مجسمہ ساز۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں رسول حمزہ کی عمر صرف بیالیس برس تھی لیکن سر کے بال جب بھی مجھ سے زیادہ سفید تھے۔ فربہ، کشیدہ قامت، بہت چھوٹی آنکھیں، بہت لمبی ناک، سرخ و سفید رنگ، بہت باتونی، بہت بذلہ سنج، زبان ہر وقت قینچی کی طرح چلتی ہے۔ بات بات پر قہقہہ لگاتے ہیں۔ پہلے سے معلوم نہ ہو تو ہرگز اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ انتہائی غیر سنجیدہ مزاج انسان انتہائی سنجیدہ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور اس پر طرہ یہ کہ اس عظیم الشان مملکت یعنی سوویٹ یونین کا نائب صدر بھی ہے۔

مہاچ قلعہ میں ہماری آمد کے اگلے دن جمہوریہ داغستان کے ایوانِ حکومت میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد ہوا جس میں رسول حمزہ کو لینن انعام کا طلائی تمغہ پیش کیا گیا، عبدالرحمان دانیال نے صدارت کی۔ لینن کی جانب سے ماسکو آرٹ تھیٹر کے ڈائرکٹر رسول کو سند اور تمغہ دے چکے تو روسی، آذربائیجانی، گرجستانی، ترکمانی، اور کرغز ادیبوں نے ممدوح کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم، ایک سپاہی، ایک کسان خاتون اور ایک مزدور نمائندے نے تقریریں کیں اور اپنی اپنی تنظیم کی طرف سے رسول کو تحفے پیش کئے۔ سپاہی نے ایک منقش چوبی قبض، کسان خاتون نے چاندی کی درانتی اور مزدوروں کے نمائندے نے ایک چوبی مجسمہ۔ میں نے اس طرح کی ایک آدھ اور تہنیتی تقریب میں بھی شرکت کی ہے مثلاً اسی زمانے میں شہرۂ آفاق

ادیب شوونوف کی ساٹھویں سالگرہ کی تقریب منائی گئی تھی۔ ان سب میں طلبہ، سپاہی، کسان، مزدور نمائندوں کی شرکت کا اسی طرح التزام کیا جاتا ہے۔) ہال کی بالکنی پر داغستانی سازندوں کا ایک طائفہ بیٹھا تھا جو تقاریر کے وقفوں کے دوران شادیانے بجاتا رہا۔ سب کچھ ہو چکا تو دو چار بغلی کمروں میں مہمانوں کی شربت پانی سے تواضع کی گئی۔ اس کے بعد ہال میں شعر و موسیقی کی محفل منعقد ہوئی۔ رسول کی نظمیں اور گیت گائے اور سنائے گئے۔ اور ان کے مطابق مرتب کیے ہوئے عوامی رقص اور سازینے پیش کیے گئے۔ یہاں سے فراغت ہوئی تو ہم لوگ اپنے ڈاک بنگلے نما مہمان خانے میں تھوڑی دیر دم لے کر مہاچ قلعہ سے ذرا فاصلے پر بالائے کوہ ایک وسیع اور پُرفضا باغ میں پہنچے۔ جہاں سبزے کے قطعے پر دعوت کا انتظام تھا۔ یہاں پھر تقریریں ہوئیں، جام صحت تجویز ہوئے عالمی امن اور صلح و آشتی کے لیے، ادب اور شعر کے لیے، روسی، گرجستانی، داغستانی، ترکمانی اور پاکستانی عوام اور ادیبوں کے نام پر۔ اور آخر میں بیگم عبدالبصیر نے کہا "میں سب ماؤں کا جامِ صحت تجویز کرتی ہوں، وہ مائیں جو شاعروں، فنکاروں، بہادروں اور شہیدوں کو جنم دیتی ہیں۔ وہ مائیں جن کے ماتھے اپنے کامران بیٹوں کے کارناموں سے رشکِ آفتاب ہیں اور جن کے کلیجے اپنے شہید بیٹوں کے دکھ میں داغ داغ۔"

مہاچ قلعہ جمہوریہ داغستان کا صدر مقام اور اس خطے کا علمی، تہذیبی، اور صنعتی مرکز ہے۔ یہاں کارخانے ہیں، سرکاری دفاتر ہیں، یونیورسٹی ہے، سائنس اکاڈمی ہے، تاریخ، عمرانیات اور آثارِ قدیمہ کے تحقیقی مراکز ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن اس نئے نویلے شہر میں داغستان کا اپنا رنگ بہت نمایاں نہیں ہے۔ سوویٹ یونین کے ان نئے شہروں کو دیکھ کر اپنے ہاں کے نہری علاقوں کے نوآباد شہر یاد آتے ہیں۔ مثلاً سرگودھا، ساہیوال، خانیوال وغیرہ جو سب ایک دوسرے کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ سیدھی متوازی سڑکیں، برابر فاصلوں پر چوک، یک وضع مکان، وسطی جلسہ گاہ اور کھلا میدان اور کسی مناسب مقام پر چمن یا باغات، البتہ کیسپین سمندر اور چوطرفہ پہاڑیوں کے سبب سے مہاچ قلعہ کا منظر نسبتاً زیادہ خوشنما ہے۔

رسول حمزہ صحیح کہتے تھے کہ "یہ اصل داغستان نہیں ہے۔ وہ دیکھنا چاہو تو پہاڑوں سے ادھر میرا گاؤں چل کر دیکھو۔" چنانچہ اگلے دن ہم ان کا گاؤں دیکھنے پہنچے۔

دو ٹولیوں میں بٹ کر ہم کوئی بیس نفر دو چھوٹے چھوٹے مٹیالے رنگ کے پرانے طیّاروں میں بیٹھے جنہیں جہاز نہیں کھٹولے کہنا چاہیئے۔ ذرا سے وقفے کے بعد سمندر اور مہاچ قلعہ کا میدان نظر سے اوجھل ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے اصل داغستان ہے۔ سبز اور گلابی کوہستان کا لامتناہی سلسلہ کوئی چٹیل کوئی شاداب، یہاں ہیبتناک گھاٹیاں ہیں اور حسین و تر و تازہ وادیاں، پرانے حصاروں کے کھنڈر ہیں اور نئی سرکاری عمارتوں کی سرخ چھتیں۔ بار بار گمان ہوتا ہے کہ اگلے وقتوں میں جن لوگوں نے ان چٹانوں کا سینہ شگاف کر کے یہاں بستیاں بسائیں، باغ لگائے، اور فصلیں اگائیں وہ یقیناً فرہاد ہی کے ہمسر اور قرابت دار ہوں گے۔ کوئی گھنٹے بھر کی پرواز کے بعد ہم ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک مختصر سے مرغزار میں اترے، جو اس علاقے "خنزہ" کا صدر مقام ہے اور جہاں سے یہی دو کھٹولے روزانہ مہاچ قلعہ کو پرواز کرتے ہیں۔ اس مرغزار میں رسول حمزہ اور ان کے مہمانوں کی پذیرائی کے لئے بچّوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ سب سے پہلے علاقے کے سب سے معمّر اور سب سے عمر رسیدہ بزرگ جن میں سے کسی کی عمر ایک صدی سے کم نہ ہوگی اپنے نامور فرزند کو خوش آمدید کہنے بڑھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اکثر مسرت بھی ہوئی اور کچھ اچنبھا بھی ہوا کہ اشتراکی روس کے ہر علاقے میں بالعموم اور مسلم علاقوں میں بالخصوص بزرگی عمر کے آداب و تعظیم کی مشرقی روایت ابھی تک قائم ہے۔ اگرچہ جیسا کہیں اور لکھ چکا ہوں یہ ادب و لحاظ بڑوں چھوٹوں کی باہمی دوستی میں مانع نہیں آتا۔ مغربی ممالک میں تو خیر اس روایت کا نام و نشان بھی باقی نہیں، وہاں تو بڑھاپا انتہائی غیر فیشن ایبل چیز سمجھی جاتی ہے اور سب بوڑھے سینگ کٹا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے لئے پریشان رہتے ہیں۔ رنج اس بات کا ہے کہ اس مغربی رشتے سے ہمارے خالص مشرقی معاشرے بھی متاثر ہو رہے ہیں۔ لیکن سے یہ تاسف اس وجہ سے ہو کہ ہم لوگوں کو زندگی کی خزاں میں وہ مراعات حاصل نہیں ہیں جو ہماری زندگی کی بہار میں ہمارے بزرگوں کو میسّر تھیں۔ تو خیر پہلے ان بوڑھوں نے رسول حمزہ کا منہ سر چوما اور پھر باقی مجمع نے رسول پر یلغار کر دی جس کی لپیٹ میں ہم لوگ بھی آ گئے۔ بچّوں کی رنگین ٹوپیاں، عورتوں کی سیاہ یا پھولدار شالیں اور موباف، مردوں کی بڑے گھیر گھار کی سیاہ یا بھوری اونی کلاہیں سب آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ بالکل فیشن ایبل بانکوں کو چھوڑ کر یہاں قریب قریب

سب مرد ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں خواہ ان کا منصب اور مقام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی گھٹنوں تک لمبے بوٹ، سیاہ یا نیلی برجس نما پتلون، بند گلے کا چرمی کوٹ یا صدری اور بہت بڑی گول اونی ٹوپی۔ عورتیں عام طور سے ٹخنوں تک لمبا ڈھیلا کرتا پہنتی ہیں جو کشمیری پھرن سے ملتا ہے۔ پاؤں میں سیاہ جوتے اور سر پر شال یا چوگوشیہ رومال۔ عمر رسیدہ عورتوں کا لبادہ اور اوڑھنی عام طور سے سیاہ رنگ کی ہوتی ہے اور نوجوان عورتوں کا لباس رنگین اور پھولدار۔ ان کے چہرے کھلے رہتے ہیں اور سر ڈھکا رہتا ہے۔ ننگے سر پھرنا مردوں، عورتوں دونوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ داغستانی گھروں میں زنانہ مردانہ کی تقسیم تو نہیں لیکن عام طور سے عورتیں مردوں کی محفل میں بہت کم شرکت کرتی ہیں بلکہ مرد مہمان گھر میں ہوں تو کھانے کی میز پر بھی ساتھ نہیں بیٹھتیں۔ لیکن قومی رفاہی اور معاشرتی سرگرمیوں میں مرد عورتیں برابر شرکت کرتے ہیں اسی سبب سے اس جمہوریہ کے قومی اور ریاستی اداروں میں بہت سے اعلیٰ عہدے عورتوں کے پاس ہیں اور رسول حمزہ کے گاؤں کی سربراہ بھی ایک خاتون تھیں۔

تھوڑی دیر افراتفری کے بعد استقبالیہ مجمع پھر سے صف بستہ ہوا۔ سب معززین درمیان میں یکجا ہوئے اور رسمی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ علاقے کے پارٹی لیڈر نے تقریر کی، رسول کے گاؤں کی نمبردار خاتون نے تقریر کی، گاؤں کی ایک کم سن طالبہ اور ایک بزرگ کسان نے تقریر کی مہمانوں کی جانب سے ممتاز روسی شاعر تووردوسکی نے (جن کا اب انتقال ہو چکا ہے) تقریر کی اور پھر موٹر اور جیپ گاڑیوں میں بیٹھ کر ہمارا جلوس رسول حمزہ کے گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ داغستان کے کوہستانی دیہات کی وضع قطع کچھ کچھ ہمارے ضلع ہزارہ کے بعض دیہات سے ملتی جلتی ہے۔ پتھر یا لکڑی کے یک منزلہ مکان، بل کھاتی ہوئی سنگ بستہ گلیاں، بیچوں بیچ ایک پتلی سی شفاف آبجو اور گھروں سے ملے ہوئے سیب خوبانی اور شفتالو کے چھوٹے باغات۔ ہر گھر کی صورت ایک بند قلعے کی سی ہے۔ چاروں طرف اونچی پتھر کی دیوار جس میں نہ روزن ہے نہ دریچہ، صرف ایک صدر دروازہ ہے جسے صدر کے بجائے عقبی دروازہ کہنا چاہیئے اس لئے کہ وہ عام طور سے گلی یا بازار کے بجائے مکان کے پہلو یا عقب میں کھلتا ہے۔ مکان میں داخل ہوتے تو پہلے ایک ڈیوڑھی، اس سے نکل کر صحن یا باغ اور یک رویہ رہائشی کمرے، رسول کے گھر کے سامنے ان کے والد

حمزہ سادا کا مجسمہ اور یادگار نصب ہے (وہ بھی یہاں کے نامور انقلابی شاعر تھے) دروازے کی چوبی محراب پر بہت خوبصورت عربی حروف میں بیت حمزہ سادا“ اور نجار کا نام کندہ ہے۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو چند سیاہ پوشش معمّر خواتین نے جو پھول لیے کھڑی تھیں خالص عربی لہجے میں ہمیں اہلاً وسہلاً“ کہا، ہم سب سے مصافحہ کیا اور اپنی زبان میں دعا دی۔ مصافحے کا ذکر آیا تو سن لیجیے کہ یہاں کے مرد ہاتھ ملاتے ہیں تو یورپی لوگوں کی طرح صرف انگلیوں سے انگلیاں نہیں ملاتے، پہلوانوں کی طرح پنجہ کشی کرتے ہیں اور دست و بازو کی خیریت مطلوب ہو تو اس معاملے میں ذرا چوکنا رہنا چاہیے۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ہم ایک کافی کشادہ دالان میں داخل ہوئے۔ بڑے بڑے غیر تراشیدہ شہتیروں اور سرکیوں کی چھت، فرش پر نمدے اور قالین، دیوار سے لگے ہوئے لکڑی کے بنچ اور ان کے آگے لمبی لمبی میزیں، میں نے کسی سے کہا کہ اگر یہاں یہ بنچ اور میزیں نہ ہوں تو بالکل ہمارے کسی دیہاتی گھر کے دالان کا نقشہ ہے۔ اس پر ان صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا ”یہ تو مہمان خانہ ہے میاں، ورنہ ہم اپنے گھروں میں میز کرسی پر کہاں بیٹھتے ہیں فرش ہی پر بساط جمتی ہے۔“

اتنے میں کھانا چنا جانے لگا، ابلے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے قتلے، لہسن ملا ہوا دہی، مکی اور پنیر کے پراٹھے، اچار، پیاز اور پودینے کی چٹنی اور بہت سی کچی سبزیاں، یہاں کا کھانا بہت سادہ اور غیر مرصع ہے لیکن لذیذ اور صحت بخش۔ کھانے کے ساتھ ساتھ پھر سے تقریروں اور جام ہائے صحت کا سلسلہ شروع ہوا، رسول حمزہ کے لیے، میزبانوں کے لیے، مہمانوں کے لیے، مہمانوں میں اجنبی اور بدیسی مہمان صرف میں ہی تھا باقی سب مختلف جمہوریتوں کے معروف ادیب تھے جنہیں بیشتر لوگ پہلے سے جانتے تھے۔ چنانچہ جب پاکستان کا جام صحت تجویز ہوا تو مجمع میں سنسنی سی دوڑ گئی، بہت تالیاں پٹیں، بہت ہنگامہ ہوا۔ صرف ایک نعرۂ تکبیر کی کسر رہ گئی تھی۔ میرے ساتھ ایک گرجستانی شاعر بیٹھے تھے، انہوں نے داغستان اور پاکستان قافیہ ٹھہرا کر ایک فی البدیہہ قطعہ بھی کہہ ڈالا۔ دو ڈھائی گھنٹے صحبت رہی، لوگ کھا پی کر سیر ہو چکے تھے تو ایک کونے سے مقامی ملیشیا (پولیس) کے سردار مقصود حمزہ نے بلند آواز میں کہا ”صاحبو! ناشتے کی میز پر کب تک بیٹھے رہو گے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا، اب میرے ہاں چل کر کھانا تناول فرمائیے۔“ ”لاحول ولا قوۃ“، میں نے اپنے ہمسائے سے کہا ”تو گویا یہ صرف ناشتہ تھا؟“ ”بھئی ابھی آپ

نے کھایا ہی کیا ہے" وہ صاحب بولے۔ اب ہم مقصود صاحب کے گھر پہنچے۔ ان کا گھر نسبتاً زیادہ مکلّف تھا، اب کے کھانے میں داغستان کی مخصوص غذا کے علاوہ کچھ روسی اور گرجستانی پکوان بھی شامل تھے۔ پھر تقریریں ہوئیں۔ پھر جام صحت تجویز ہوتے، جوں توں کچھ حلق سے اتارا اور بستر کی طلب ستانے لگی۔ اتنے میں کہیں سے آواز آئی "دوستو! اس چار دیواری میں کب تک بند بیٹھے رہو گے، ذرا دیکھو باہر دھوپ کتنی حسین ہے سرکوہ سبزہ زار پر چل کر بیٹھو، جہاں ہر طرف پھول کھلے ہیں اور معطر ہوائیں چل رہی ہیں۔ جہاں وہ روپہلی آبجو رواں ہے جس میں کبھی دختر خان نہایا کرتی تھی۔ کھانے پینے کا باقی پروگرام وہیں پر ہوگا۔"

اب ہم نے جس جگہ پر ڈیرے ڈالے اگر دختر خان نے واقعی نہانے کے لئے اسے انتخاب کیا تھا تو اس کے ذوق کی داد دینا چاہیے۔ یہ جگہ نیلے پیلے خودرو پھولوں سے اٹی ہوئی ایک وسیع لہریا سبزہ زار ہے۔ شمال اور جنوب میں سربفلک پہاڑ کھڑے ہیں، مشرق میں جدھر سے ہم آتے تھے سارا، خنزہ اور دوسری آبادیاں ہیں، اور مغرب میں کئی ہزار فٹ گہرا قریب قریب عمودی کھڈ ہے، یہاں پر مختلف سمتوں سے آئی ہوئی پتلی پتلی دودھیا ندیوں کے آبشار گرتے ہیں اور دریا کی شکل میں بہنے لگتے ہیں۔

سبزے پر جگہ جگہ قالین بچھے تھے، ایک طرف دو خیمے نصب تھے۔ ایک میں گوشت کٹ رہا تھا۔ دوسرے میں دیگیں چڑھی تھیں۔ ہم صبح سے کھا کھا کر نڈھال ہو چکے تھے۔ سب قالینوں پر دراز ہو گئے۔ ایک داغستانی صاحب میرے پہلو میں آکر بیٹھ گئے۔

"مسلمان بالحمدللہ ہے"

میں نے کہا "الحمدللہ"

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"

میں نے دھرایا۔

انہوں نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنا تعارف کروایا، "محمد علی!"

میں نے کہا بہت خوشی ہوئی۔

اب انھوں نے میری ترجمان خاتون سے کہا "تم ہٹ جاؤ، ہم خود بات کریں گے"! پھر ملی جلی عربی فارسی اور اشاروں سے پہلے دوستی اور محبت کا اظہار کیا اور پھر بتایا کہ اگلے دن ان کی بچّی کی سالگرہ ہے اور درخواست کی کہ میں اپنے ہاتھ سے ان کی بچّی کے لئے کچھ لکھ دوں جس کا نام سعادت ہے۔ اس نام سے اتفاقاً اپنی بھی کوئی بھولی بسری یاد وابستہ ہے، میں نے غالب کا شعر لکھ دیا۔ تم سلامت رہو

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ترجمہ سنایا گیا تو آس پاس کے سب سننے والے پھڑک گئے۔ غالب کے احوال اور اس کے مزید کلام کی فرمائش ہوئی۔ میں نے سنائے تو گرجستانی شاعر کلاڈ کلوز نے غالب کے کئی اشعار فی البدیہہ اپنی زبان میں منظوم کر دیئے۔

پھر لڑکیوں نے پرا باندھ کر پرانے اور نئے داغستانی گیت گائے، پومورخ اور اوزائی کی داستان جو یہاں کا مرزا صاحباں سمجھ لیجئے۔ ہزبر اور باطر ابجور کے جنگ نامے، ندیوں اور پہاڑوں کے گیت، لینن اور انقلاب کے گیت، علیشیا کے کڑیل بانکے سردار مقصود دو میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور بولے۔ "دیکھو ہم لوگ ان پہاڑوں میں اڑنے والے عقابوں کی طرح سبک پرواز ہیں اور جفاکش، ہم دوستوں کے دوست ہیں، کبھی دوست سے دغا نہیں کرتے، کبھی جھوٹا قول نہیں ہارتے۔ ہم سے دوستی کرلو اور جب کوئی افتاد پڑے تو ہمیں پکارو، ہم دوست کی آواز ہزاروں میل دور سے پہچان لیتے ہیں۔"

اب سائے گہرے ہو چکے تھے اور پروگرام کے مطابق ہمیں پانچ بجے واپسی کے لئے جہاز پر پہنچنا چاہیئے تھا، میں نے رسول حمزہ سے کہا "سوا پانچ بج چکے ہیں اور آپ لوگ ابھی تک یہیں بیٹھے ہیں۔ جہاز چھوٹ جائے گا۔" وہ کہنے لگے "بٹاؤ جی، یہ بھی کوئی ماسکو ہے کہ جہاز چھوٹ جائے گا، یہاں تو سب ہمارے اپنے جہاز ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا چلے گا۔"

خیر کوئی چھ بجے ہم ہوائی میدان میں پہنچے تو دور دور کسی طیارے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ رسول نے ایک دو چکر کنٹرول کے لگائے اور کہنے لگے "یار بہت حماقت ہو گئی۔ ہم نے صبح پائلٹ کو دعوت میں نہیں

بلایا تو وہ روٹھ گیا ہے۔ اس نے کہلا بھیجا ہے جاؤ میں نہیں لاتا جہاز۔"

کسی نے مجھ سے سرگوشی میں کہا "یہ سب جھوٹ ہے، جہاز کب کے آکر واپس جا چکے۔ یہ پاکھنڈ صرف تم کو ایک رات یہاں روکنے کے لیے کیا ہے۔"

مجبوراً ہم سب پھر گاڑیوں میں سوار ہوئے اور دوبارہ گاؤں کا رُخ کیا۔ کسی ایک گھر میں بیس آدمیوں کو ٹھہرانے کی گنجائش کہاں تھی، چنانچہ ہم ایک ایک دو دو کر کے مختلف گھروں میں بٹ گئے۔ میرے میزبان رسول کے گاؤں سارا اور اس کے نواح کی کولخوز یعنی مشترکہ فارم کے سربراہ محمد خطیب صاحب تھے۔ نہایت مہذب، شائستہ اور باخبر انسان، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کسرتی جسم، بہت سرخ رنگ، سر گھٹا ہوا، داغستانیوں کی مخصوص لمبی عقابی ناک اور تیز عقابی آنکھیں۔

ان کا گھر نسبتاً نئی وضع کا ہے۔ بیرونی صحن میں انار، ناشپاتی اور سیب کے پودے اور ترکاریوں کی کیاری ہے۔ یہاں سے گزر کر چار پانچ سیڑھیاں چڑھ کر اونچی کرسی کے مکان میں داخل ہوتے ہیں۔ اس میں اس سرے سے اس سرے تک جالی دار بالکنی ہے جس میں ایک سمت کچھ آرام کرسیاں بچھی ہیں اور درمیان میں ہاتھ دھونے کے لیے ایک چھوٹا سا حمام اور سلفچی رکھی ہے۔ دوسری طرف کھانے کی میز ہے اور کچھ سیڑھیاں جو غسل خانے میں اترتی ہیں، چار کافی کشادہ کمرے ہیں جو اس بالکنی میں کھلتے ہیں۔ بجلی اور پانی کا نل تو خیر ہر گھر میں ہے۔ خطیب صاحب کے ہاں دو ریڈیو سیٹ اور ریفریجریٹر بھی ہے۔

خطیب صاحب نے مجھے بتایا کہ ان کے کولخوز میں سات گاؤں شریک ہیں جن کی آبادی کوئی چار ہزار نفر ہے۔ اس کولخوز کے زیرِ اہتمام گندم، مکّی اور مختلف پھلوں کی کاشت ہوتی ہے اور بھیڑوں کے گلّے پالے جاتے ہیں جو حکومت کو بیچے جاتے ہیں اور کولخوز کی بیشتر آمدنی اسی پر منحصر ہے۔ گندم اور پھل اگر کولخوز کے ممبروں کی ضرورت سے فاضل ہو تو مقامی منڈیوں میں فروخت ہوتا ہے۔ قریباً چالیس ہزار بھیڑیں کولخوز کی ملکیت ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شخص ایک گائے اور دس بھیڑیں ذاتی ملکیت میں رکھ سکتا ہے۔ ہر گھر کو ایک ایکڑ کے قریب زمین ذاتی باغ یا کھیتی باڑی کے لیے رکھنے کی بھی اجازت ہے۔ ہر گاؤں کا اپنا اسکول ہے، آٹھویں جماعت تک تعلیم مقامی زبان آدلا میں دی جاتی ہے البتہ پانچویں جماعت

سے روسی زبان بھی لازمی ہے۔ کولخوز کا اپنا ہسپتال ہے جس میں ایک سو بیس مریضوں کو داخلے کی سہولتیں میسر ہیں۔ دو زچگی خانے ہیں۔ ایکسرے اور جملہ طبی اور جراحی کا ساز و سامان موجود ہے۔ مہاچ قلعہ کے لئے روزانہ ہوائی سروس ہے اور بسوں اور موٹروں کے لئے پکی سڑک۔

رات گزارنے کے لئے خطیب صاحب نے میرے لئے اپنا کمرہ خالی کر دیا، اس کمرے کو دیکھ کر ہرگز یہ گمان نہ ہوتا تھا کہ داغستان کے دور افتادہ علاقے کے ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ کسی معمولی کسان کا کمرہ ہے۔ عین بین کسی شہری پروفیسر کی بیٹھک معلوم ہوتی تھی، دیواروں پر نقشے اور مختلف شہروں کی تصاویر، چاروں طرف کتابوں کی الماریاں، پڑھنے کی میز پر رسالے اور اخبارات، ایک ریڈیو سیٹ، ایک بڑا سا کلاک، پڑھنے کا لیمپ، کاغذ، پنسلیں اور سگریٹ۔

صبح وہی، پنیر، مربہ اور مکی کے پراٹھوں کا ناشتہ کر چکے تو رسول حمزہ نمودار ہوئے اور عذر و معذرت کے پل باندھ دیئے "بھئی تم بھی کیا کہتے ہو گے کہ عجب بدتمیز آدمی ہے۔ مہمان کو کسی کے گھر پہنچا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا لیکن بات یہ ہے کہ مصروفیت کے باعث گاؤں میں کم ہی آنا ہوتا ہے۔ اس دوران میں کسی گھر میں ماتم ہو گیا ہے، کہیں شادی ہوئی ہے، کسی کے ہاں بچّہ ہوا ہے، کسی کے لڑکے نے یونیورسٹی میں کامیابی حاصل کر لی ہے، ان سب گھروں میں جانا ضروری ہے۔ کسی سے تعزیت کرنی ہے، کسی کو تہنیت پہنچانا ہے۔ اب مشکل سے سب کو نپٹا سکا ہوں۔ چلو اب ناشتے کو چلیں۔

"ناشتہ تو ہم کر چکے" میں نے کہا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے، چلنے سے پہلے میرے گھر کے علاوہ آپ کو دو جگہ اور بھی ناشتہ کرنا ہے۔"

تین چار جگہ ناشتے کے بعد ہم لوگ ہوائی میدان میں پہنچے تو طیاروں کے سامنے کچھ لوگ دہی ابلا ہوا گوشت اور مشروبات لئے کھڑے تھے۔

"ارے بھئی کچھ خدا کا خوف کرو، یہ کیا ہے۔"

"کھانا پڑے گا" محمد علی نے کہا "ہمارے ہاں کی رسم ہے۔"

پانچواں باب

مکالمے

ماسکو شہر ایک طرح سے دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں کا بین الاقوامی مسافر خانہ ہے۔ کوئی ایک دن کے لیے آیا کوئی ایک ماہ کے لیے اور کوئی مرحوم ترک شاعر ناظم حکمت کی طرح آیا تو یہیں کا ہو رہا۔ چنانچہ جتنے باکمال لوگوں سے یہاں یا سوویٹ یونین کے دوسرے شہروں میں ملاقات رہی ہے ان کے محض نام گنوانے کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں اوّل تو مختلف سوویٹ جمہوریتوں کے اہل ہنر کی پوری فوج ہے جن میں بعض کا تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ پھر یورپ، ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ادیبوں کا کارواں ہے۔ مثلاً اٹلی کے البرٹو موراویا، فرانس کے سارتر، انگلستان کے پروفیسر ایمپسن، اینگس ولسن، ولیم گولڈنگ، افریقہ کے لیوپولڈ سینگھور، جو اب سینیگال کے صدر ہیں، لاطینی امریکہ کے نرودا، عراق کے الجواہری، لبنان کے مشعل سلیمان اور سہیل ادریس، فلسطین کے محمود درویش اور معین بسیسو، مصر کے عبدالرحمان قیمنسی، ڈاکٹر سندر یوسف الصباعی، جاپان کے یوشی ہوتا، اور ہندوستان کے سب پرانے دوست۔ غرض کس کس کا نام لوں۔ سوویٹ میزبانوں میں سے کچھ تو دنیا سے رخصت بھی ہو چکے جن میں بعض سے نیازمندی تھی جیسے عظیم ناولسٹ اور صحافی الیا اہرن برگ یا بزرگ شاعر دردوفسکی تھے، بعض سے دوستانہ تھا جیسے نقاد اور ناول نگار کوچی توف تھے اور بعض سے یارانہ جیسے یوری ردین سوف تھے۔ ان سولہ سترہ برس میں کس کس سے کتنی بار ملاقات ہوئی اور کیا کیا باتیں ہوئیں اگر یاد کرنے بیٹھوں تو غالباً بقیہ عمر اسی میں گزر جائے گی۔ اور اپنی یادداشت تو اتنی ناقص ہے کہ کل کی سنی ہوئی بات بھی یاد نہیں رہتی اور صحافت سے کنارہ کشی کے بعد نوٹس لکھنے کی

عادت نہیں رہی۔ صرف دو تین صحبتوں میں گفتگو کا ایک آدھ نکتہ جو ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے فی الحال انہی پر اکتفا کرتا ہوں۔

① ناظم حکمت

ناظم حکمت کا نام ہم بہت پہلے سے جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ موجودہ دور میں ترکی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ انگریزی میں ان کی نظموں کے تراجم کا ایک مختصر سا مجموعہ بھی لاہور میں ہاتھ آ گیا تھا جسے بہت سے لوگوں نے بہت شوق سے پڑھا۔ یہ مجموعہ بیشتر حبسیات پر مشتمل ہے اور ناظم کے طویل ایام اسیری کی یادگار ہے۔ چنانچہ میں اپنے جیل خانے کے دنوں میں ناظم کے جیل خانے کے ایام کا یہ مصرعہ اکثر یاد کرتا تھا،

آلام کچھ بھی ہوں

اپنا نگینوں بھرا دل درخشاں رکھو،

ناظم حکمت نے زندگی کا بہت سا حصہ ترکی کے جیل خانوں میں گزارا اور پھر فرار ہو کر سوویٹ یونین میں پناہ لی وردہیں بس گئے۔ اگرچہ ان کا دل یہاں ہر طرح کی آسائش بہم ہونے کے باوجود یاد وطن میں تڑپتا رہا اور جلاوطنی میں لکھے ہوئے ان کے بیشتر حزنیہ اشعار کا موضوع یہی ہے۔

۱۹۵۸ء میں تاشقند کی افرو ایشیائی ادبی کانفرنس کے پروگرام میں ہم نے ایک مشاعرہ بھی رکھوا دیا تھا جو یہاں کے لوگوں کے لئے ذرا نئی چیز تھی۔ سوویت یونین میں ہماری طرح کلام شاعر بزبان شاعر کا دستور تو ہے لیکن عام طور سے ایسی تقریبات میں صرف ایک معروف شاعر کا کلام سنا جاتا ہے، یا کسی خاص تقریب کی مناسبت سے متعلقہ موضوع پر نظم اور نثر دونوں پیش کئے جاتے ہیں۔ شاعروں کا اکھاڑا نہیں رچایا جاتا۔ اسی تاشقند مشاعرے میں ناظم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور اس کے بعد اس سے دوستی اور محبت کا رشتہ ۱۹۶۳ء میں ان کی ناگہانی وفات تک قائم رہا۔

ناظم حکمت دیکھنے میں بہت وجیہہ آدمی تھے۔ ستواں قد، چھریرا بدن، گہرے سنہری گھنگھریالے بال، بھوری آنکھیں، بہت تیکھے نقش اور سرخ و سفید رنگ۔ عمر میں مجھ سے آٹھ دس برس بڑے ہوں گے لیکن بالکل نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ خاندان کے رئیس، ایک پاشا کے پوتے، نوجوانی میں اناطولیہ میں جنگِ حریت میں شرکت کی اور اس کے بعد عوام کے لئے عملی اور تحریری جدوجہد میں اپنی زندگی صرف کردی۔ تاشقند کانفرنس کے بعد جب ہم ماسکو پہنچے تو ناظم نے ہم دو چار دوستوں کو اپنے "ڈاچا" یعنی مضافاتی آرام گاہ میں مدعو کیا۔ یہ تین بڑے بڑے کمروں کی ایک بہت ہوادار چوبی عمارت تھی۔

ایک دو گھنٹے کھانے پینے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے میں گزرے، پھر ناظم نے کہا "چلو بھئی اب دوسرے کمرے میں چل کر گپ کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ گپ کرنے کے آداب سے ہماری طرح پرانے رومن لوگ تو آشنا تھے جو کھانا بھی لیٹ کر ہی کھایا کرتے تھے لیکن ان یورپین لوگوں کو یہ فن بالکل نہیں آتا۔ ہر وقت کرسیوں سے جڑے بیٹھے رہتے ہیں۔" چنانچہ ہم اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے، یہاں ہر دیوار کے ساتھ ساتھ تخت نما لمبے لمبے کوچ رکھے تھے۔ دیواروں پر دورِ حاضر کے نامور مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں اور ناظم کے مختلف ڈراموں کے پوسٹر تھے جو ماسکو کے علاوہ اور بہت سے شہروں میں اسٹیج ہو چکے تھے۔ ناظم نے کہا لو اب لیٹ کر آرام سے گپ کرتے ہیں۔ شعر کے اسلوب، ہیئت اور لغت کی بات چلی جس کا سلسلہ اس کے بعد کئی صحبتوں میں میرے اور ناظم کے درمیان جاری رہا۔ ناظم کا کہنا تھا کہ "قطعی آزاد شاعری یا آزاد نظم کا وجود تو ممکن ہی نہیں جیسا کہ نظم کے لفظ ہی سے ظاہر ہے۔ الفاظ کو کسی ترتیب سے جوڑنا بجائے خود ایک پابندی ہے اور شعر میں کچھ تلازمے اس پہ مستزاد بھی ہیں تاکہ شعر نثر کی سطح سے اوپر اٹھ سکے اور چونکہ شعر نے موسیقی ہی کے بطن سے جنم لیا ہے اس لئے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ اسے کسی مخصوص اور واضح ردم، لے یا آہنگ کا پابند ہونا چاہیے۔ جو شعر کے موضوع اور کیفیت کے مطابق ہو۔ لیکن اس میں عام طور سے دھوکا یہ ہوتا ہے کہ اس لے یا آہنگ کی جو صورتیں بزرگ پہلے سے وضع کر گئے ہیں ان سے تجاوز کرنا مناسب نہیں، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ ان کے علاوہ کسی اور لے یا آہنگ کی تخلیق ممکن ہی نہیں۔ یہ بات

صحیح نہیں ہے۔ اصل میں ہر زبان کی روزمرہ بول چال کا اپنا ایک مخفی اور قدرے بکھرا ہوا آہنگ ہوتا ہے جس پر پوری توجہ دی جائے تو اس سے کئی طرح کے مترنم صوتی خاکے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ عوامی گیت تو خیر بہت واضح چیز ہے لیکن اگر تم کسی بوڑھے شہری یا دیہاتی داستان گو سے کوئی پرانا قصّہ سنو تو اس کی نثر میں بھی تمہیں اس زبان کا آہنگ ملے گا۔ کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ اپنی زبان میں اس کے فطری آہنگ و ترنم کے امکانات دریافت کر کے اپنے شعر کی لے ان کے قریب لائی جائے۔ لیکن ہم عام طور سے ایسا نہیں کرتے مثلاً تم اپنی اردو زبان یا میری ترکی زبان کی مثال لے لو۔ ان زبانوں کا اپنا لہجہ اپنا صوتی آہنگ تو کچھ اور ہے لیکن شعر میں پیروی سب عربی عروض کی کرتے ہیں۔ وہ کیوں بھئی؟ یہ پرانے اوزان اور بحریں تو عربوں نے اپنی زبان، اپنی بول چال، اپنے رجز، اپنے گیتوں اور نغموں سے برآمد کی تھیں اور یہ بھی تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ ان کی لے کا اصل ماخذ اونٹ کی چال کا ردم ہے تو ہم اس عربی لکیر کے فقیر کیوں بنے بیٹھے ہیں؟ ویسے اپنی اپنی ضرورت اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق قدیم شعراء نے عربی بحروں میں ترمیم و اضافے اور تصرفات تو کیے جو سب نے قبول بھی کر لیے لیکن عروض کے بنیادی ڈھانچے سے منحرف ہونے کی ہمت کسی کو نہیں ہوئی۔ چنانچہ جب میں نے شعر لکھنا شروع کیا تو سب سے پہلے یہی مسئلہ سامنے آیا اور جب سے میں نے کوشش شروع کی کہ شعر میں عروض کے متبادل کوئی آہنگ پیدا کرنے کی صورت کی جائے پھر آہستہ آہستہ میں نے عروض کا سہارا لینا چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب بہت سے جدید ترک شاعر ایسے ہی لکھنے لگے ہیں۔"

اس موضوع پر ہماری کئی بار گفتگو ہوئی اور بعض نظمیں جو میں نے ماسکو میں لکھی تھیں اور اس کتاب میں دوسری جگہ درج ہیں "غالب" نہی صحبتوں سے متاثر ہیں۔

ناظم کہتے تھے "میری باتوں سے یہ مت سمجھ لینا کہ میں شعر و ادب کی پرانی روایت کے خلاف ہوں یا اس سے بالکل قطع تعلق کے حق میں ہوں، بلکہ اگر غور کرو تو بات اس کے برعکس ہے۔ یہ اس طرح کہ ہماری روایت کا اصل ماخذ تو پرانا عوامی ادب ہے، عوامی گیت ہیں، داستانیں ہیں، رزمیے ہیں۔ کلاسیکی طرزِ اظہار اور عروض کی پابندی کا دور تو بعد میں آیا، اور اس تبدیلی کی وجہ محض شاعرانہ یا ادبی اپج

کی تحریک نہیں تھی بلکہ بنیادی وجہ تو معاشرے کے نظام اور بود و باش کے طور طریقوں کی کایا پلٹ تھی یعنی پرانے خود مختار اور خود کفیل قبائلی نظام کی جگہ بادشاہی، نوابی یا جاگیرداری نظام نے لے لی تھی۔ اس نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ نظام نے ایک نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تہذیب پیدا کی اور شعروادب کو اسی سانچے میں ڈھال لیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ ہمارے مشرقی ممالک میں صدیوں تک یہی نظام منجمد ہو کر رہ گیا اور اسی کے نتیجے میں ہم نے قدامت پسندی اپنا شعار ٹھہرا لیا۔ شعروادب میں بھی، سیاست اور معیشت میں بھی لیکن اب یہ دور گزر چکا۔ انسانی دنیا صنعتی دور میں داخل ہو چکی ہے۔ زندگی کی لے بدل گئی، بود و باش کے طریقے بدل گئے، انسانی رشتوں کی صورتیں مختلف ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ اس دور میں انفرادی اور اجتماعی انسانی تجربات کی نوعیت اور ماہیت یا متن اگلے زمانے سے بالکل مختلف ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے مناسب اور مؤثر اظہار کے لئے نئی صورتیں اور نئے سانچے بھی درکار ہوں گے۔ نظریاتی طور سے تو یہ سب لوگ تسلیم کرتے ہیں لیکن عملی طور سے بات جہاں پر اٹک جاتی ہے وہ ذہنی یا نظریاتی مسئلہ نہیں فنی یا جمالیاتی مسئلہ ہے۔ یعنی محض حقیقت کا اظہار ہی کافی نہیں اس اظہار میں حسن کاری بھی لازم ہے۔ شروع شروع میں اس مسئلے کی پیچیدگی کا مجھے بھی پوری طرح احساس نہیں تھا چنانچہ اب میں سمجھتا ہوں کہ میری ابتدائی شاعری جو بیشتر سیاسی اور جلسے جلوس کی شاعری ہے بالکل یک رخی یا ون ڈائی مینشنل شاعری ہے جو وقتی یا ہنگامی طور پر مفید بھی ہوتی ہے اور مؤثر بھی لیکن جس کی لغت اور ہیئت میں کسی انسانی تجربے کی گہرائیوں اور نزاکتوں کا عکس نہیں ملتا۔

"روایت، ہیئت اور موضوع کے الگ الگ خانے نہیں بنائے جا سکتے۔ مثلاً موضوع کے تقاضے کے مطابق میں نے پابند شاعری بھی کی ہے بلکہ اگر پرانے زمانے کی کوئی داستان منظوم کی ہے تو اس زمانے کی صحیح فضا پیدا کرنے کے لئے قدیم اور متروک زبان بھی استعمال کی ہے اور اس علاقے کی عوامی دھنوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ فارم یا ہیئت کے بارے میں پہلے بھی میں نے کسی سے کہا تھا کہ اس کی صورت تو کسی حسینہ کی ساقِ سیمیں پر ریشمی جراب کی سی ہے جو ساقِ سیمیں کے حسن میں تو اضافہ کرے لیکن خود زیادہ نمایاں نظر نہ آئے۔"

اس پر میں نے حسرت موہانی کا شعر سنایا اور بہت داد پائی،

رنگِ قبا سے مل گئی خوبیِ جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اپنے استدلال کے ثبوت میں ناظم وقتاً فوقتاً اپنی نظمیں بھی سناتے رہے۔ ترجمے میں ان کا حسن کیا دکھائی دے گا۔ بہرحال دو چار تراجم اگلے باب میں شامل ہیں۔

۲ الیا اہرن برگ

۱۹۶۲ء غالباً جولائی یا اگست کا مہینہ ہے۔ لینن گراڈ شہر۔ علامہ اقبال کو "سوادِ رومۃ الکبریٰ" میں دلی یاد آئی تھی لیکن اس شہر کا تو کوئی بدل ہماری طرف موجود نہیں۔ ماسکو کے برعکس یہ بالکل یورپین طرز کا شہر ہے۔ سڑکیں، چوراہے، عمارتیں، گرجے، شہر کے بیچوں بیچ بہنے والے دریائے نیوا کے پل بیشتر مغربی وضع کے ہیں لیکن پشکن کی زبان میں 'کانسی گھوڑے کے شہسوار' پیٹر اعظم کا بسایا ہوا یہ شہر روس کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور انقلابی تاریخ کے آثار سے مالا مال ہے۔ پیٹر اعظم کے گھڑسوار مجسمے سے لب دریا شہر کی جانب چلو تو ہر عمارت کوئی نہ کوئی پرانی یا نئی تاریخی یاد جگائے گی۔ اس مکان میں پشکن بزدل سرا ہوا کرتا تھا۔ اس مہیب قلعہ میں سیاسی قیدی روشنی اور آزادی کو ترستے تھے۔ وہ "آرورا" جہاز ہے جس کے عرشے سے اکتوبر انقلاب کی توپ داغی گئی تھی، یہ سمولنی انسٹی ٹیوٹ ہے جہاں لینن نے اپنی انقلابی حکومت تشکیل کی تھی اور یہ زار کا محل ہے جو اب ہرمی تیج عجائب گھر کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے جس کے سب نوادرات، تصاویر، مجسمے، جواہرات، ظروف، ملبوسات وغیرہ وغیرہ اچھی طرح دیکھنے کے لئے چند گھنٹے تو کیا چند دن بھی کافی نہیں۔

اگلے دن یہاں یورپین ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اور کچھ ایفرو ایشیائی ادیب بھی مبصر کی حیثیت میں مدعو کئے گئے ہیں۔ چنانچہ میں اور ایلس بھی آج ہی لندن سے یہاں پہنچے ہیں، دن بھر شہر میں پیدل گھومنے کے بعد سب لوگ ہوٹل میں سستا رہے ہیں لیکن اپنا دل نہیں مانتا کہ اس شہر

میں ایک لمحہ بھی کسی بند کمرے میں ضائع کیا جائے۔ ہوٹل سے چند قدم پر ایک مختصر سا پارک ہے اور اس کے وسط میں پشکن کا دراز قد مجسمہ۔ اس وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس نے لینن گراڈ کی نالسی شام کو لبادے کی طرح اوڑھ رکھا ہے اور دو تین ٹمٹماتے ہوئے ستارے اس کے گھنگھریالے بالوں میں الجھ گئے ہیں۔ نہ جانے وہ اس وقت سرنگوں کس سوچ میں غرق ہے۔ لیکن شاید اس کی دردمند آنکھیں شفقت اور ترحم سے ان نوخیز جوڑوں کو تک رہی ہیں جو اس کے چاروں طرف آہنی بنچوں پر چھدرے چھدرے پتوں کی اوٹ میں اپنے وفورِ شوق کو چھپانے کی عبث کوشش کر رہے ہیں۔

اگلے دن ہم کانفرنس کے لیے لینن گراڈ ادیبوں کی انجمن کے صدر دفتر میں جمع ہوئے جو گئے وقتوں میں کسی بڑے امیر کا محل تھا۔ مندوبین میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ فیدن، ایلیا اہرن برگ، شولوخوف، سارتر، ایمپسن، جان لیمان اور کئی دوسرے۔ تین دن کے مختصر قیام میں ان سب سے تو ملاقات ممکن نہ تھی، بنتے اور میں نے اپنی دوست مریم سلگانیک کے ذریعہ اہرن برگ اور سارتر صاحب سے ملاقات کی فرمائش بھیجی اور ایک ہی سہ پہر میں ان دونوں بزرگوں سے یکے بعد دیگرے ملاقات کا وقت طے ہوا۔

پہلے اہرن برگ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ جب بھی کافی ضعیف نظر آتے تھے، کمر جھک گئی تھی، آنکھیں بھی کچھ دھندلا رہی تھیں، چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی، میانے قد کے دبلے پتلے آدمی تھے جن کو دیکھ کر کسی تھکے ہوئے شکاری پرندے کی یاد آتی تھی۔ اہرن برگ صاحب کی بہت سی باتیں تو ہم کانفرنس کے دوران ہی میں سن چکے تھے جب انہوں نے سوویٹ یونین کے بارے میں مغربی ادیبوں کے بعض اعتراضات کا جواب دیا تھا۔ کوئی کوئی فقرہ مجھے یاد ہے۔ ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں کچھ اچھی چیزیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہاں کے جدید ادب کا بہت سا حصہ آپ کے کہنے کے مطابق سپاٹ اور بے کیف ہوتا ہے جسے تخلیقی اعتبار سے معیاری ادب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ کتابیں لکھنے والوں کے اپنے جذبات و محسوسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے آپ کی انجمن کی انتظامیہ کے ایما پر ان کے نظریات کی تبلیغ کے لیے

لکھی جاتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا کہنا ایک حد تک تو صحیح ہے لیکن دو تین باتوں پر ذرا غور فرمائیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جب ہم نے انقلاب برپا کیا تھا اور سوویٹ معاشرہ تشکیل دیا تھا تو ہم نے آپ سے اور ساری دنیا سے یہ اقرار تو ضرور کیا تھا کہ ہم ایک سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے جا رہے ہیں۔ ہم سرمایہ داری، جاگیرداری، مطلق العنانی، استحصال اور وہ سب خباثت ختم کر دیں گے جو طبقاتی نظام سے مخصوص ہیں۔ یہ سب وعدے تو ہم نے کیے تھے اور ہم انہیں پورا بھی کر چکے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ کب عہد کیا تھا کہ ہم گھٹیا ادب پیدا نہیں کریں گے اور یہ بھی کب کہا تھا کہ ہماری ادیبوں کی تنظیم میں کچھ بودم قسم کے لوگ بھی بقراط بن کر نہیں بیٹھ جائیں گے۔ خیر اس بات کو چھوڑئیے اب یہ بتائیے کہ آپ جسے گھٹیا یا غیر معیاری ادب کہتے ہیں وہ کس زبان میں، کس ملک میں اور کس دور میں اچھے اور بڑھیا ادب کے مقابلے میں زیادہ کثرت سے پیدا نہیں ہوا ہے آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیے آپ کے ہاں جو ہر روز سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں لچر یا بچکانہ کتابیں چھپتی ہیں ان کے مقابلے میں سنجیدہ اور معیاری ادب کے کتنے نمونے سال بھر میں سامنے آتے ہیں ہے چلئے ہمارا ادب بے کیف ہے سپاٹ ہے، بے مزہ ہے لیکن آپ کے تجارتی اداروں کی طرح اس میں زہر اور کیچڑ کی ملاوٹ تو نہیں ہوتی۔ ہمارے ادیب یہاں کے محنت کشوں کی زندگی یا یہاں کے قومی تعمیری منصوبوں کے بارے میں اکثر لکھتے ہیں اور بعض اوقات کامیابی سے نہیں لکھ پاتے لیکن آپ کے پیشہ ور ادیبوں کی طرح جرم اور فحاشی، یا امراء کی گھریلو زندگی کے ناز نخرے تو اپنا موضوع نہیں ٹھہراتے۔

"آپ کہتے ہیں کہ ہم نے انقلاب کے بعد ٹالسٹائے، دوستوئیفسکی، چیخوف یا گورکی جیسا بھی بڑا ادیب کیوں پیدا نہیں کیا کیونکہ گورکی بھی انقلاب سے پہلے ہی کی پیداوار ہے۔ یہ بھی آپ کا کہنا ٹھیک ہے، ہم نے ٹالسٹائے جیسا بڑا ادیب اس بیس تیس سال میں نہیں پیدا کیا لیکن ہم نے وہ ذات پیدا کی ہے جو آپ ایک ہزار سال میں نہیں کر سکتے۔ ہم نے بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ گریٹ ریڈر۔ جو آپ کے معاشرے میں نہ اب ہے اور نہ اس کی موجودہ صورت میں کبھی ہوگا۔ شیکسپیر تو آپ کا ادیب ہے ہمارا تو نہیں ہے لیکن آپ نے گزشتہ تین سو برس میں اس کے جتنے ایڈیشن جتنی تعداد

میں چھاپے ہیں غالباً ان سے زیادہ گزشتہ بیس برس میں ہم چھاپ چکے ہیں۔ اور پھر آپ کے ہاں اسکول یا یونیورسٹی سے باہر شیکسپیر کون پڑھتا ہے ؟ یہاں ہر کوئی اس سے آشنا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جینئیس جیسے ہومر ہے، یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے، کہیں بھی اور کسی دور میں بھی پیدا ہو وہ تو ہمیشہ ایک اتفاق یا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے اس لئے اس کی پیدائش کا سہرا کسی معاشرے یا کسی دور کے سر باندھنا معقول بات نہیں اور اگر وہ کسی جگہ پیدائش سے انکاری ہے تو کسی پر الزام بھی نہیں دھر سکتے۔"

سہ پہر کے وقت ہم اور میں اہرن برگ صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے، بہت خندہ پیشانی سے ملے، اٹھ کر مصافحہ کیا اور فرانسیسی زبان میں خیریت پوچھی، کانفرنس کے بارے میں کچھ باتیں ہوئیں پھر پوچھا کافی پیو گے ؟ پھر ساتھ ہی معذرت شروع کر دی "ویسے پوچھو تو کسی مہمان کو اس ہوٹل کی کافی پیش کرتے ہوئے مجھے ندامت ہوتی ہے، یہ بھی کوئی پینے کے لائق چیز ہے۔ لیکن اس ہوٹل پر کیا منحصر ہے کوئی سا ہوٹل یا کوئی ساگھر ہو روس میں ایسی ہی کافی ملے گی۔ دراصل ہم روسیوں کو دو کاموں کا سلیقہ بالکل نہیں آتا اور نہ میرے خیال میں کبھی آئے گا۔ ایک تو یہ اچھی کافی نہیں بنا سکتے اور دوسرے ہوٹلوں کے لئے اچھی تصویر بنانا نہیں جانتے۔ یہ دیکھو یہ سامنے کیا لٹکا رکھا ہے۔" کمرے کی دیوار پر کچھ ویسی ہی مبتذل یا نہ قسم کی تصویر آویزاں تھی جو ہوٹلوں میں اکثر دیکھنے میں آتی ہے، کسی جنگل، پہاڑ یا وادی کا منظر۔ "لیکن ہوٹل کے کمرے میں اس طرح کی تصویریں لگانے میں ایک منطق بھی ہے" اہرن برگ کہنے لگے "دیکھیے نا ہوٹل میں تو آپ زیادہ سے زیادہ دو چار دن مہمان ٹھہرتے ہیں۔ پھر آپ کو گھر لوٹنا ہوتا ہے اس لئے بالکل معقول بات ہے کہ ہوٹل کے کمرے میں دلفریبی کا کوئی ایسا سامان نہ دکھایا جائے جس کی یاد بعد میں آپ کو ستاتی رہے کیونکہ نہ جانے آپ کبھی اس ہوٹل میں دوبارہ آئیں نہ آئیں اور آئیں بھی تو کیا شرط ہے کہ وہی کمرہ آپ کو دوبارہ ملے۔ اس لئے ہوٹل کے کمرے میں جو بھی سامان مہیا کیا جاتا ہے وہ فرنیچر ہو یا برتن ہوں یا دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر ہو، سب کچھ غیر ذاتی امپرسنل، میکانکی، اور بیگانہ قسم کا ہونا چاہیئے جو آپ کمرے سے نکلتے ہی اپنے ذہن سے محو کر سکیں۔" پھر روس کے جدید ادب کی بات شروع ہوئی جس کا تذکرہ کانفرنس میں ہو چکا تھا۔ کہنے لگے "دیکھو بھئی انقلاب کے وقت

ہماری بیشتر آبادی ناخواندہ تھی، ایک عام کسان مزدور نے کتاب پڑھنا تو کیا کبھی کتاب کو چھو کر بھی نہ دیکھا تھا کہ اس کا لمس کیسا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے سامنے پہلا کام یہ تھا کہ پڑھے لکھے اور دانشور لوگوں کو بھول کر پہلے اس مخلوق کو جو ہماری اصل قوم ہے پڑھنے کی لذت سے آشنا کریں اور اس کے لئے لازم تھا کہ ہم وہی باتیں لکھیں اور اسی انداز سے لکھیں جو وہ سمجھ سکیں اور دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ خیال یہ تھا کہ جیسے جیسے ان کا تعلیمی اور ذہنی معیار بلند ہوگا ویسے ہی بتدریج ان کے جمالیاتی اور فنی ذوق کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی۔ اور یہی ہوا ہے۔ میں تمہیں ایک قصہ سناتا ہوں۔ آج سے کوئی تیس پینتیس برس بیشتر میں اور میرے ایک دوست جو یہاں کے کافی ممتاز ادیب ہیں ایک کارخانے میں کسی تقریب پر گئے۔ حسب معمول تقریریں ہوئیں اور نظمیں وغیرہ پڑھی گئیں۔ ہم دونوں نے بھی کچھ کہا سنا۔ جب ہم لوٹ رہے تھے تو میں نے اپنے دوست سے کہا دیکھئے ہمارے اصل پڑھنے والے اصل سننے والے تو یہ ہیں۔ آپ ان کے لئے کچھ کیوں نہیں لکھتے۔ وہ کہنے لگے بھئی یہ لوگ میرے معیار کو نہیں پہنچتے اور میرے لئے ان کی سطح پر اتر کر کچھ لکھنا بہت مشکل ہے۔ "خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ لیکن حال ہی میں تیس پینتیس برس بعد مجھے اسی کارخانے میں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ کارخانے کی لائبریری میں اور کتابوں کے علاوہ میرے اس دوست کی کتابیں بھی رکھی ہیں، میں نے ان میں سے ایک دو کتابیں کسی پاس کھڑے ہوئے مزدور کو دکھائیں اور پوچھا کہ ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے وہ کہنے لگے۔ "کتابیں خیر ٹھیک ہیں لیکن یہ ہمارے معیار کو نہیں پہنچتیں۔" ایک اور مثال لے لو۔ آج کل ہماری سوویٹ ادیبوں کی انجمن کو دو مسئلوں کا سامنا ہے۔ ایک مسئلہ تو کاغذ کا ہے جو آج کل بہت کمیاب ہے اور دوسرا مسئلہ ایلیا اہرن برگ کا ہے اس لئے کہ آج کل ہماری آپس میں ان بن ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تھوڑے دن پہلے میری خود نوشت سوانح عمری دو جلدوں میں اور دس لاکھ کی تعداد میں چھپی ہے۔ جب اس کی اشاعت اور دکانوں میں پہنچنے کی تاریخ کا اعلان اخباروں میں کیا گیا تو مقررہ دن سے ایک رات پہلے سے لوگ کتابوں کی دکانوں پر قطاریں بنا کر کھڑے ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کتاب ختم نہیں ہو گئی۔

۴ سارتر

اہرن برگ صاحب سے رخصت ہوکر ہم سارتر کے کمرے میں گئے۔ انہیں بھی کانفرنس میں دیکھ چکے تھے لیکن کسی وجہ سے میں ان کی تقریر نہیں سن سکا تھا۔ شکل وصورت میں سارتر ایلیا اہرن برگ سے قطعی مختلف نظر آتے۔ پستہ قد کے گول مٹول، ہشاش بشاش، چاق چوبند آدمی ہیں، ایک آنکھ میں کچھ نقص ہے اس لئے موٹے شیشوں کا چشمہ چڑھائے رکھتے ہیں، دیکھنے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی عظیم اور معتدر مفکر یا ادیب ہیں۔ یہی گمان ہوتا ہے کہ کوئی بینکر یا کاروباری آدمی ہوں گے۔ ان کی قریب قریب سب کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہمارے ہاں آسانی سے دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ مغرب کی بیشتر تنقیدی کتب میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ پھر ان کی بیوی تو نہیں کہنا چاہیے رفیقہ حیات سیمون دبووآر کی کتابوں میں ان کی شخصیت کی بہت سی جھلکیاں بھی ہم لوگ دیکھ چکے ہیں اس وجہ سے انہیں ملے تو ہمیں کسی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ کچھ وقفے کے بعد سیمون دبووآر بھی اپنے کمرے سے ہمیں آملیں، عمر ڈھل چکی ہے لیکن بہت طرحدار، خوش وضع اور خوش لباس خاتون ہیں۔
سارتر کا چرچا تو پہلے پہل فلسفۂ وجودیت کے واسطے سے ہوا تھا لیکن دوسری جنگ عظیم کے تجربات اور پھر ویتنام اور الجزائر کی جنگِ آزادی نے ان کے نظریات بہت حد تک بدل ڈالے ہیں، خاص طور سے الجزائر میں فرانسیسی جارحیت کے خلاف اور الجزائر کے مجاہدین کی حمایت میں ان کی شجاعانہ قلمی اور علمی مہم ایک بہت قابلِ قدر معرکہ ہے اور اسی کے ذکر سے بات شروع ہوئی۔
سارتر کہنے لگے " دو تین سو برس سے سب مغربی ملکوں پر فتحمندی کا نشہ طاری تھا اس دوران میں ان کی آپس میں ہار جیت ہوتی رہی لیکن ان لڑائیوں میں کسی ہارنے والے نے اپنی ہار تسلیم نہیں کی اور وہ اس کی ذمہ داری ہمیشہ غلط کار سیاست دانوں نالائق جرنیلوں یا یہودی سرمایہ داروں اور غیر ملکی ایجنٹوں پر ڈالتے رہے۔ چنانچہ اس فتح وشکست سے ان کی انا اور احساسِ برتری میں کوئی فرق نہیں آیا۔
ان کا یہ تکبر اور پندار اسی صورت سے ٹوٹ سکتا تھا کہ انہیں کسی ایسے غنیم سے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑے جس

کا انسانی یا قومی وجود وہ تسلیم ہی نہ کرتے تھے یعنی ایشیا اور افریقہ کے محکوم اور پسماندہ عوام کا کوئی ملک۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ ویتنام اور الجزائر کے حریت پسندوں نے اپنی فتحمندی سے اپنی سرزمین پر ہی نہیں فرانس، اور امریکہ پر بھی بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو اہلِ فرانس کو اپنے ضمیر سے صفائی معاملات کرنے میں نہ جانے اور کتنے دن لگتے تمہارے ہاں سے اگر انگریز بغیر لڑائی کئے واپس چلے گئے تو انہوں نے تم پر یا اپنے لوگوں پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ دونوں سے کچھ دھاندلی کی ہے۔ اگر وہ تمہیں بھی کچھ جہاد کا موقعہ دیتے تو شاید اوّل تو تمہارا آپس میں خون خرابہ ہی نہ ہوتا اور دوسرے تمہارے عوام کو اپنے دل وجگر اور دست و بازو کی طاقت کا بھی صحیح اندازہ ہو جاتا۔ پھر انگریز عوام بھی تمہیں اپنے سے برتر نہیں تو برابر کی مخلوق سمجھنے لگتے۔ خیر یہ بات چھوڑو، خالص ادبی اعتبار سے دیکھو تو اس خونچکاں جنگ و پیکار سے دامن بچا کر نہ جانے آپ لوگ کتنے عظیم ادبی شاہکاروں سے محروم رہ گئے ہیں۔ پھر خود ہی اپنی بات کاٹ کر کہنے لگے "نہیں بھئی یہ بات نہیں ہے، میری ہرگز یہ مراد نہیں کہ بڑا ادب صرف جنگ یا جدال وقتال سے پیدا ہوتا ہے، کہنا مجھے یہ تھا کہ بڑا ادب پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی ہمت آفریں شجاعانہ موضوع چاہیے جس میں انسان اپنے سے کسی بڑی طاقت سے نبرد آزما ہوتا ہے اب یونانی زمانے کے دیوی دیوتا اور ان کے کارندے تو باقی رہے نہیں، جن سے پرانے زمانے کے ہیرو نبرد آزما ہوا کرتے تھے۔ اب تو یہ تصادم مادی، معاشرتی اور سیاسی طاقتوں ہی کے خلاف ہو سکتا ہے۔ بھوک، افلاس، پس ماندگی، جبر و تشدد، اجتماعی درد و غم اور اجتماعی جہد و مشقت، عذاب و نجات، ایثار و استحصال، یہ موضوعات اگر کہیں ادیب کو دستیاب ہیں تو وہ ایشیا اور افریقہ ہی کی سرزمین میں ہیں یا پھر مختلف صورت میں سوشلسٹ ممالک میں جہاں انسان انسان سے نہیں فطرت یا نیچر سے محو پیکار ہے۔ اور تسخیر فطرت سے بڑا موضوع اور کیا ہو گا۔ لیکن ہمارے پاس یورپ یا مغربی ممالک میں اب لکھنے کو کیا رہ گیا ہے۔ بھوک، بیماری، غربت، غلامی، وہ سب کچھ تو ہم پیچھے چھوڑ آئے، اب کوئی برِ اعظم ہمارے پاس فتح کرنے کو نہیں۔ اپنے ملکوں کے سب کونے کھدرے کھنگال لئے کوئی بڑا موضوع ہی نہیں ملتا۔ طبقاتی کشمکش کا تناؤ فلاحی نسخوں نے ڈھیلا کر دیا ہے اب تو یہی ہے کہ جنس اور لاشعور کے جوہڑوں پر بیٹھے گھٹیا جذبات کے کیڑوں بھنگوں کا

نکھار کھیلا کریں یا ماورائی خلاؤں میں مختلف مفروضات کے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کسی کو لکھنے اور سوچنے کا ڈھب آتا ہے تو وہ ان کے بارے میں بھی اچھی کتاب لکھ لے گا اور اچھی کتابیں لکھی جارہی ہیں لیکن ان میں سے کسی بھی کتاب کو آپ ہومر یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے کے مقابلے میں تو نہیں رکھ سکتے البتہ فن اور تکنیک میں بہت سے دلچسپ تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ ترقی بھی ہو رہی ہے اور اس میدان میں آپ لوگ ابھی تک گھٹنوں کے بل چل رہے ہیں۔ وہ اس لئے کہ آپ کے اپنے آباؤ اجداد کی ادبی روایتوں کو تو ہم لوگوں نے آگے چلنے نہیں دیا اور آپ کو لامحالہ ہمارے اسالیب اظہار کی ابجد سے شروع کرنا پڑا۔ کچھ ہونہار لوگ اس پر قادر بھی ہو گئے لیکن وہ مستثنیات میں سے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کئی اور لوگوں میں کہیں زیادہ جوہر موجود ہو جو محض اس وجہ سے نہیں لکھ سکا کہ انہیں اعلیٰ تعلیم کے مواقع ہی میسر نہیں آتے۔ تو موجودہ صورت حال یہ ہے کہ تکنیک ہمارے پاس ہے، موضوعات آپ کے پاس ہیں، کوئی صاحب کمال ان دونوں کو یکجا کرے گا تو اس صدی کا ہومر یا شیکسپیر یا ٹالسٹائے جنم لے گا۔"

ہم میں سے کسی نے پوچھا کہ شیکسپیر، ٹالسٹائے تو پیدا ہو گا جب ہو گا آپ کے نظریہ ادب میں عاشقانہ یا غنائیہ ادب کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں ہے کہنے لگے "ہے کیوں نہیں، وہ تو ہر دل کا ایک فطری تقاضا ہے جس کی تسکین لازم ہے لیکن وہ تو ایک پگڈنڈی ہے، شاہراہ نہیں ہے، ادب کی شاہراہ کو جو کسی دور میں اسے ایک منزل سے اگلی منزل تک پہنچاتی ہے اس دور کی ذہنی، فکری، جذباتی اور اخلاقی افق پر پوری طرح محیط ہونا چاہیے ورنہ بات آگے نہیں بڑھے گی۔ قبائلی دور کے شاعر کو اپنے قبیلے کے افسانہ و اساطیر اور قبیلے پر بیتے ہوئے واقعات اور تجربات کے علاوہ اور کچھ جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے عہد کا تقاضا ہی اتنا تھا۔ لیکن آج کل کا ادیب اگر انسانی معاشرے کی تاریخ اور معاشیات کی جدلیات سے بے بہرہ ہے تو ہم عصر حقائق کے بارے میں اس کا جذباتی اور جبلّی ردّعمل خواہ کتنا بھی صحیح ہو اسے باہر کی دنیا تو کیا اپنے اندر کی دنیا کے کھوٹے کھرے کا بھی پورا اندازہ نہ ہو سکے گا اور تذبذب اور بے یقینی اس کی تحریروں میں بھی ملے گی۔"

۴ سلیمانوف

۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں مجھے دوبارہ آلما آتا جانے کا اتفاق ہوا جو قازقستان جمہوریہ کا صدر مقام ہے۔ یہیں قازقستان کے مقبول اور معروف شاعر اولجز عمر علی سلیمانوف (سلیمان) سے ملاقات ہوئی۔ اسی کانفرنس کے بعد ایک طویل اور المناک سفر میں ان کا ساتھ رہا جب سید سجّاد ظہیر کانفرنس کے دوران ہی میں اچانک ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے اور ہم ان کی میت کو سپردِ خاک کرنے آلما آتا سے دہلی پہنچے۔ سلیمان بہت بانکے اور شگفتہ جوان ہیں۔ ابھی چالیس کی عمر کو نہیں پہنچے لیکن علم اور فن و ادب کے کئی شعبوں میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ قازقستان کی ریاستی یونیورسٹی سے پہلے علم الارضیات (جیالوجی) کی تربیت حاصل کی۔ پھر ماسکو میں ادبیات کے متعلم رہے۔ قازقستان کی زبان اور تاریخ پر تحقیق کی، کچھ عرصہ قازقستان کے سرکاری فلم اسٹوڈیو میں بھی کام کیا اور دستاویزی فلمیں بنانے کے علاوہ اسٹوڈیو کے فلم میگزین کی ادارت بھی کرتے رہے۔ گزشتہ صفحوں میں جن اصحاب کی باتیں میں نے تحریر کی ہیں وہ تو سب میری زبانی ہیں لیکن سلیمان کے کچھ خیالات میں انہی کے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں۔

"ترک خانہ بدوش قبائل میں سے قازق لوگوں نے سب سے آخر میں، یعنی اسی صدی میں، دشت نوردی چھوڑ کر بستیوں میں بسنا سیکھا۔ ہم لوگ ہمیشہ سے مشرق اور مغرب کے نرغے میں گرفتار رہے۔ اسی سبب سے ہماری قدیم اور جدید ثقافت اور ہماری روزمرّہ زندگی مشرق و مغرب دونوں سے متاثر ہے۔ ہماری قدیم اور جدید ثقافت میں ترکوں کی روایت پسندی، بدھوں کا گیان دھیان، مسلمانوں کی اجتماعیت اور یورپین لوگوں کی انفرادیت سبھی شامل ہیں۔ مجھے تاریخ سے عشق ہے، اپنے قدیم آباؤ اجداد کی تاریخ میں مجھے ان اہم ابتدائی روایتوں کی تلاش رہتی ہے جو کسی باقاعدہ دستاویز میں محفوظ نہیں لیکن جنہیں ذہن نشین کئے بغیر انسانی برادری کی مختلف شاخوں کے موجودہ اور آئندہ رشتوں کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مجھے ان اشعار کی تلاش ہے جو لکھے نہیں گئے، ان تحریروں کی جن کا نشان نہیں ملتا، ان خطبات کی جو سننے میں نہیں آئے، میں اپنے ماضی میں انہیں تلاش کرتا ہوں تاکہ حال کی زبان میں انہیں دوبارہ ادا

کر سکوں۔

"ہمارے دور میں ایک قازق کو مجبوراً ایک سائنسی محقق بننا پڑتا ہے اس لئے کہ کاروان کے آخری اونٹ کو سب سے زیادہ بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ کاروان والے رستے میں جو کچھ گراتے آتے ہیں سب اسی آخری اونٹ پر لاد دیا جاتا ہے۔ یوں بھی میں سمجھتا ہوں کہ ہر نسل کو ایسی ہی سرگرمی اور تندہی سے کام کرنا چاہیئے گویا وہ اپنے قبیلے کی آخری نسل ہے۔ ہمیں شعوری طور سے ان سب سچائیوں کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیئے، جنہیں سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے ہمارے بے فکر آباؤ اجداد کے پاس نہ فرصت تھی نہ دماغ اسی لئے بعض اوقات ہمیں ایسی نئی باتوں پر وقت صرف کرنا پڑتا ہے جو بظاہر بالکل بے مصرف اور بیکار نظر آتی ہیں اسی سبب سے ہم سیکنڈے نیویا کے اساطیر کی تفسیر طلب کرتے ہیں، تاریخ اور سیمر کے آثار کا مطالعہ کرتے ہیں، موہنجو دارو کے کتبوں کے معنی تلاش کرتے ہیں۔

"ایک شاعر کا کلام اس سے نہیں جانچنا چاہیئے کہ اس کے اشعار کی تعداد کیا ہے بلکہ اس امر سے کہ اسے اپنے لکھے سے کتنا حظ و سرور حاصل ہوا۔ ہم کسی شاعر سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس موضوع یا اس خیال یا اس نمونے پر شعر لکھ دو، اسے تو ہزار طرح کے چھوٹے موٹے ریزہ ریزہ مضامین، خیالات اور واقعات میں سے اپنا انتخاب خود کرنا ہوتا ہے اور اسے حق ہے کہ جو بھی اسے دلپسند معلوم ہو اسی کے گن گاتا رہے۔"

⑤ چنگیز اتماتوف

چنگیز اتماتوف سوویٹ یونین کے مقبول ترین اور معروف ترین نثر نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی افسانوی تصانیف "الوداع گل سرائے"، "جمیلہ"، "مدرس"، "سفید جہاز" سوویٹ یونین کی مختلف زبانوں کے علاوہ متعدد یورپی اور ایشیائی زبانوں میں طبع ہو چکی ہیں۔ "الوداع گل سرائے" کا اردو ترجمہ رضیہ سجاد ظہیر کے قلم سے دہلی میں چھپ چکا ہے اور پاکستان میں زیر طبع ہے۔ چنگیز جمہوریہ قرغزستان کے رہنے والے ہیں اور قرغز اور روسی دونوں زبانوں میں یکساں سہولت سے لکھتے ہیں۔ لینن انعام اور دوسرے

کئی اعزازات سے سرفراز، سپریم سوویٹ کونسل کے رکن، فلمی کارکنوں کی انجمن کے معتمد، قرغز ادیبوں کے سربراہ اور کم عمری کے باوجود سوویٹ یونین کے ادبی اور سیاسی حلقوں میں موقر اور معتبر مقام رکھتے ہیں۔

دو چار برس پہلے ماسکو ٹیلی ویژن نے میرے ہوٹل میں ان سے ایک مفصل انٹرویو کا اہتمام کیا تھا جس کی روداد ذیل میں درج ہے۔

فیض: میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں اپنے ناظرین سے مخاطب ہوں، جیسے کہ آپ کو علم ہے سوویٹ یونین میں بہت سی قومیں آباد ہیں۔ بہت سی زبانیں رائج ہیں، اور ہر زبان کا اپنا مخصوص ادب ہے۔ ہم اجنبی لوگ سوویٹ ادب کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہماری نگاہ یا تو صرف کلاسیکی ادب کی طرف جاتی ہے، یا ان گنے چنے انقلابی ادیبوں کی جانب جو روسی زبان میں لکھتے ہیں اور باہر کی دنیا میں معروف ہیں، اس ٹیلی ویژن پروگرام کا ایک مقصد یہ ہے کہ آپ کو اس وسیع سرزمین کے چند مقتدر ادیبوں سے متعارف کرانے کی سعی کی جائے۔ آج میں آپ کو ایک ایسے ہی بلند پایہ ادیب سے روشناس کروانا چاہتا ہوں جن کا تعلق قرغز جمہوریہ سے ہے۔ چنگیز اتماتوف نامی ہے، لینن انعام یافتہ اور سپریم سوویٹ کونسل کے رکن ہیں، سوویٹ یونین کے ہر علاقے کے علاوہ ان بیرونی ممالک میں بھی مقبول ہیں جہاں ان کے تراجم ہو چکے ہیں۔

ہاں تو چنگیز صاحب میں آج کی گفتگو کا آغاز ایک ایسے سوال سے کرنا چاہتا ہوں جو غالباً آپ سے بیسیوں بار پوچھا جا چکا ہے اور جس کا پورا تسلی بخش جواب مشکل سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس نوع کا پروگرام عام طور سے کسی ایسے ہی سوال سے کیا جاتا ہے اس لئے شاید بارِ خاطر نہ ہو۔ سوال یہ ہے کہ آپ ادیب بنے کیسے؟ یعنی آپ کو پہلے پہل ادیب بننے کی امنگ کیسے پیدا ہوئی؟ گردوپیش کے مشاہدے کے سبب سے، کتابوں کے مطالعے سے، یا کسی خاص سماجی یا معاشرتی صورتِ حال کے سبب سے، یہ تحریک کیسے ہوئی؟

چنگیز: میں بات سمجھ گیا۔ لکھنے کا جذبہ کیسے جنم لیتا ہے اور میرے اپنے ذہن میں اس کی جڑیں کہاں

تک پہنچتی ہیں دلچسپ مضمون ہے اگرچہ اپنے ان دیکھے ناظرین کے سامنے اپنی بات کرنا کچھ اشتہار بازی معلوم ہوتی ہے۔ بہرحال سنئے اگرچہ یہی سوال میں آپ سے بھی کر سکتا ہوں کہ آپ اتنے بڑے شاعر کیسے بن گئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ فوری یا اضطراری عمل ہوتا ہے۔ غالباً بچپن ہی سے آپ کو بھی ادھر رجحان رہا ہوگا، ایک طرح کا داخلی دباؤ جو تمام روحانی محرکات کو یکجا کر کے کسی ایک ایسے نقطے پر جمع کر دیتا ہے جو شاعری کی جانب لے جاتا ہے۔ میں تو شاعر نہیں ہوں، نثر نگار ہوں اور مجھے روزمرّہ زندگی کے علاوہ دور کی باتوں سے واسطہ نہیں۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ کوئی شاعر ہو یا نثر نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا عمل فطری اور مشترک ہے، اس میں کئی عوامل شامل ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ کسی نے بچپن کیسے گزارا، کیا پڑھا، کن لوگوں سے واسطہ پڑا، کیسی فضا میں سانس لی۔ مثلاً مجھے اپنی دادی اماں کے بارے میں باتیں کرنے سے ہمیشہ فرحت حاصل ہوتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دانشمند اور بہت سمجھ بوجھ والی خاتون تھیں۔ انہیں تو اس کا علم نہیں ہوگا لیکن ادب سے میری رغبت سب سے پہلے انہی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ان قصّے کہانیوں، گیتوں، پہیلیوں اور دیہاتی افکار و اقوال کی وجہ سے جو میں نے ان سے سنے۔ انہیں ایسی بیشمار چیزیں یاد تھیں جو وہ ہر کسی کو سنایا کرتی تھیں اور خاص طور سے اپنے پوتے کو یعنی مجھے۔ پھر میرے بچپن کے اواخر اور شباب کے اوائل کا زمانہ آیا تو جنگ عظیم نے آلیا۔ آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری سرزمین، ہماری قوم اور ہمارے معاشرے کے لئے یہ کیسی کڑی آزمائش کے دن تھے۔ میں نے ان دنوں میں اپنے لوگوں کو انتہائی ڈرامائی اور انتہائی دردناک واقعات کا سامنا کرتے دیکھا، ساتھ ساتھ انتہائی شجاعت کے مظاہرے بھی دیکھے۔ ایک پوری قوم کی اجتماعی شجاعت کے مظاہرے، ان سب باتوں سے کون متاثر نہ ہوتا۔ اب یہ طلب ہوئی کہ جو کچھ دیکھا ہے، جو کچھ محسوس کیا ہے اسے لکھ ڈالوں، پھر ادبیات کا اثر اپنی جگہ ہے۔ ہم سوویٹ سرزمین میں رہتے ہیں اس لئے روسی ادب سے تو بچپن ہی میں آشنا ہو چکے تھے۔ کلاسیکی ادب سے بھی اور جدید ادب سے بھی۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے لوگ پڑھنے کے کتنے شوقین ہیں، پھر روسی زبان کے وسیلے سے ہم عالمی ادب کا مطالعہ بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ یوں سمجھ لیجئے کہ میں نے جس ادبی منبع سے

فیض حاصل کیا ہے اس میں ہماری نجی عوامی روایت بھی شامل ہے، روسی ادب بھی اور عالمی ادب بھی۔

فیض۔ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ کے عوامی ادب کی روایت تو زبانی یا سینہ بہ سینہ چلتی ہے اور غالباً آپ اپنی زبان کے پہلے ادیب ہیں یا ادیبوں کی اس پہلی صف میں سے ہیں جنھوں نے اس زبان میں جدید تحریری ادب کی بنا ڈالی۔

چنگیز۔ کبھی کسی پرانی روایت کو زندہ رکھنا کوئی نئی روایت پیدا کرنے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے میں تو ان سب اسلاف کا شکرگزار ہوں جنھوں نے میری پیدائش سے پہلے تحریری ادب کے لیے راستہ ہموار کیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو بھی انسان جنم لیتا ہے اسے یہ موقع ملنا چاہیئے کہ وہ ایک مکمل شخصیت بن سکے۔ اسے یہ حق ہونا چاہیئے کہ اس کی زندگی میں اور اس کی زندگی سے پہلے جو بھی پاکیزہ اور اچھی چیزیں تخلیق ہوتی ہیں وہ ان سب سے یا زیادہ سے زیادہ سے مستفید ہو سکے۔ لیکن کبھی تاریخی اور معاشرتی وجوہ سے یوں نہیں ہوتا اور بیشمار انسان ناخواندہ اور پس ماندہ رہ جاتے ہیں، اس کا مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ اگر میں نے وہ کچھ نہ پڑھا ہوتا جو میں نے پڑھا ہے اور وہ کچھ نہ جانتا جو میں نے سیکھا ہے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ روحانی لذتوں کے کیسے کیسے ذخیرے اور ذہنی آسودگی کے کیسے کیسے سامان سے یہ مخلوق محروم کر دی گئی ہے تو میرا دل بہت کڑھتا ہے۔

فیض۔ یہ تو میرے یا آپ کے دکھی ہونے کی بات نہیں، ہماری تاریخ یا اجداد کا ورثہ ہے، آج سے تیس چالیس برس پہلے تک قریباً تین چوتھائی دنیا سامراجی حکمرانوں کے تسلط میں تھی اور بیسیوں ملکوں نے حال ہی میں آزاد اور مختار ممالک کی حیثیت سے دوبارہ جنم لیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کی تو گویا صدیوں کے بعد پہلی بار آنکھ کھلی ہے اور وہ علم و فکر کی رعنائیوں اور اپنی دنیا کے حسن و حقیقت سے پہلی بار آشنا ہو رہے ہیں۔ ان ملکوں کے ادیب انتہائی خلوص کے ساتھ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے عوام دنیا بھر کے علم و ادب سے آشنا ہو سکیں لیکن اس کے لیے صرف خلوص و جذبہ ہی نہیں وسائل اور ذرائع بھی لازم ہیں جو آپ کے ہاں تو موجود ہیں لیکن کم استطاعت ملکوں میں موجود نہیں ہیں۔

لیکن اس کمی کے باوجود ہمیں خوش ہونا چاہیئے کہ اس عمل کی ابتدا تو ہو چکی ہے اور دنیا بھر کے ادیب اور دانشور ایک دوسرے سے متعارف تو ہونے لگے ہیں۔ مثلاً رسول حمزہ کے اشعار کا ترجمہ ہمارے ہاں ہو چکا ہے، آپ کی کتاب کا ترجمہ بھی غالباً جلد طبع ہو جائے گا، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں سب لوگ مل کر کوشش کریں کہ اس دولت کا جتنا بھی حصّہ ہم اپنے لوگوں تک پہنچا سکیں پہنچا دیں۔ دنیا بھر کے ادیبوں میں کچھ نہ کچھ رابطہ تو پیدا ہو ہی چکا ہے، چنانچہ ہمیں افسردہ ہونے کے بجائے پُرامید ہونا چاہیئے کہ یہ روشنی پھیلنا شروع تو ہوئی ہے۔

اب میں آپ سے ایک دوسرا سوال کرنا چاہتا ہوں آپ کے ناولوں میں ایک بات مجھے بہت دلچسپ نظر آئی اور وہ یہ ہے کہ آپ غیر جاندار چیزوں کو جیسے پہاڑ ہیں دریا ہیں جنگل ہیں جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں اور لاشعور حیوانات کو جیسے گھوڑا گلسرا ہے انسانی کرداروں کی طرح سوچتے اور محسوس کرتے ہوئے دکھاتے ہیں، مغربی ادب میں تو اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، میں پوچھنا چاہتا تھا کہ کردار نگاری کا یہ پہلو آپ کی روایت میں شامل ہے یا آپ کی اپنی ایجاد ہے۔

چنگیز۔ میرے خیال میں بہت حد تک یہ اسی شاعرانہ روایت ہی سے متعلق ہے جو ہماری گھٹی میں پڑی ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ جمالیاتی حقیقتوں کے ادراک کا ایک قومی خاصہ ہے۔ ویسے یہ تو مسلّم ہے کہ انسان ذہنی ارتقا کی ایک منزل میں زمین، پانی، آسمان، ہر چیز کو انسانی رنگ میں دیکھتا ہے اور انہیں دیوی دیوتا بنا لیتا ہے جس کی سب سے ابتدائی صورت پانی اور زمین کی پرستش ہے، بعد میں دوسرے فطری مظاہر بھی انسانی روپ دھار لیتے ہیں، مثلاً ہمارے ہاں ایک قدیم قصّہ ہے جس میں ایک شکاری ایک علامتی جانور "خاکستری بکری" کی بیٹی پر عاشق ہو جاتا ہے جو ایک خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے لیکن وہ جب چاہتی ہے دوبارہ بکری کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ شکاری کو پھسلا کر اپنے جنگل میں بھگا لے جائے۔ لیکن یہ ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ جب ہمارے لوگ یہ قصّہ سنتے ہیں تو وہ اسے بالکل سچ سمجھتے ہیں اور انہیں اس میں کوئی غیر فطری بات نظر نہیں آتی۔ میں حقیقت پسندی کے جدید اسالیب سے واقف ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ

حقیقت نگاری میں کئی ایسی باتیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں جو بظاہر غیر حقیقی یا حقیقت سے دور نظر آئیں لیکن پھر بھی حقیقت نگاری ہی کا جز و ہیں۔ جیسے میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ میں نے روسی ادب اور عالمی لٹریچر سے بہت کچھ اخذ کیا ہے لیکن ادب یا تجربہ سے کچھ حاصل کرنا ہی نہیں ہوتا، اس بنیاد پر ہمیں اپنے تخیل اور اپنی قوتِ احساس کے بل پر کوئی نئی اور منفرد تخلیق وجود میں لانا اصل کام ہے۔ مثال کے طور پر آپ دیکھیں گے کہ میری نثر میں ایک لے ہے ایک آہنگ یا ردم ہے جو ہم قرغز لوگوں کی عام بول چال میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی سبب سے ہمیں شاعری کا ایک بہت بیش بہا ذخیرہ ورثے میں ملا ہے جو اس لئے زیادہ معروف نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ بہت مشکل کام ہے۔ اس کی ایک مثال کافی ہوگی، ہمارا ایک کلاسیکی قصّہ "مانا س" زبان زدِ عوام ہے، لیکن اس کے کم و بیش دس لاکھ با قافیہ اشعار ہیں، میں نے اور زبانوں کے ایسے قصّے پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ عالمی ادب کا ایک اہم شاہکار ہے، آپ کی قدیم شاعری میں بھی ایسی ہی تخلیقات ہوں گی جو آپ کے عوام کو عزیز ہیں، انہیں بھی عالمی ادب میں ان کا مقام ملنا چاہیئے۔

فیض۔ آپ کا قطع کلام ہوتا ہے لیکن آپ یا کسی اور ادیب نے اس قصّے کو کسی اور زبان میں ترجمہ کرنے کی زحمت کی ہے ؟

چنگیز۔۔ ہمارے بہت سے ادیب جن میں میں بھی شامل ہوں بہت تندہی سے اس کوشش میں لگے ہیں، لیکن یہ قصّہ منظوم ہے اور پھر وہ بھی با قافیہ۔ اور شاعری میری دسترس سے باہر ہے۔

فیض۔ اچھا ایک بات اور بتائیے، مجھے معلوم ہے کہ آپ روسی اور قرغز۔ دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں بہت سے ملکوں میں جن میں ہمارا ملک بھی شامل ہے ایک عام مسئلہ ہے کہ ادیب روزمرہ بول چال میں ایک زبان استعمال کرتا ہے یعنی اپنی مادری زبان اور لکھنے میں ایک دوسری زبان جو اس نے تعلیم و مطالعہ سے سیکھی ہے۔ جب آپ کوئی چیز قرغز زبان میں لکھتے ہیں اور کچھ اور چیز روسی زبان میں تو آپ کو اظہارِ مطلب میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے ؟ کیا آپ ان میں

سے ایک یا دوسری زبان میں مقابلتاً زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں۔ ؟

چینگز۔ میں اپنی ہر تحریر پر بہت محنت کرتا ہوں، ہر ورق میں کئی بار ترمیم یا اصلاح کی گنجائش نظر آتی ہے اور میں اس میں کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہوں۔ جہاں تک زبان کے انتخاب کا تعلق ہے تو اس کا حل بہت سیدھا ہے، اگر مجھے ایک زبان میں کوئی موزوں پیرایۂ اظہار نہیں ملتا تو میں دوسری زبان میں لکھ لیتا ہوں۔

فیض:۔ اب ایک آدھ سوال آپ کی تصانیف کے بارے میں۔ میں نے تو صرف آپ کے تین چار مختصر ناول یا طویل افسانے پڑھے ہیں جو انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں، آپ کا کوئی طویل ناول میری نظر سے نہیں گزرا، آپ کے ڈرامے بھی نہیں پڑھ سکا۔ پوچھنا یہ تھا کہ ان افسانوں میں جن کرداروں یا شخصیتوں کا بیان ہے، جیسے مدرّس ڈیورش اور دوسرے لوگ ہیں، یہ سب خیالی کردار ہیں یا کوئی واقعی شخصیت آپ کی نظر میں تھی جسے آپ نے افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

چینگیز۔ دیکھیے بھئی ہر افسانہ بیشتر تو افسانہ ہی ہوتا ہے لیکن اس میں عکاسی تو حقیقی زندگی ہی کی کی جاتی ہے۔ سب سے پہلے تو زندگی ہی سے کوئی تاثر یا کوئی مضمون اخذ کیا جاتا ہے، اس کے بعد اپنا ذہن یا تخیّل اسے کسی افسانوی ڈھانچے میں ڈھالتا ہے، سچ مچ کے لوگ، ایک خاص زمانے اور ایک خاص ماحول میں یہ محرّک پیدا کرتے ہیں اور پھر اس مصالحے پر تخلیقی عمل کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اس لیئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے سبھی کردار واقعی سچ مچ کی شخصیتیں ہیں لیکن وہ ہیں کون یہ ان کا نام پتہ کیا ہے۔ یہ مجھے نہیں معلوم، کئی لکھنے والے کسی مخصوص شخصیت کو سامنے رکھ کر اس کی ہو بہو تصویر کشی کرتے ہیں لیکن میری رائے میں اس نوع کی کردار نگاری ہمیشہ سپاٹ ہو جاتی ہے، میں اپنے آپ پر اس قسم کی بندش لگانے کا قائل نہیں ہوں۔ کچھ لوگ اس سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ایک ادبی یا افسانوی کردار کا ناک نقشہ کسی واقعی کردار ہی کا عکس ہونا چاہیئے۔ حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے۔ کہ زندگی کو من وعن پیش کیا جائے۔ اس مسئلے پر اکثر بحث چلتی رہتی ہے، مجھے اس سے تو اتفاق ہے کہ زندگی یا حقیقت کو صداقت

سے اور صحیح طور سے پیش کرنا چاہیے لیکن کس پیرائے میں، کس صورت میں یا کس انداز میں اس کا فیصلہ ادیب کے اپنے اختیار میں ہونا چاہیے، وہ فوٹوگرافر نہیں ہے مصوّر ہے۔

منظومات اور تراجم

جب بھی ہم ماسکو کے سفر سے گھر لوٹتے ہیں تو عام طور سے دوستوں کا پہلا سوال یہی ہوتا ہے کہ کیوں جی، وہاں پر کچھ ہوا ہے اور عام طور سے ہم شعر کی صورت میں کچھ نہ کچھ ساتھ لے ہی آتے ہیں۔ لیکن کیوں ہے میں نے اس بارے میں پہلے تو کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اب جو لکھنے بیٹھا ہوں تو اس کی ایک آدھ وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ شعر لکھنے پر طبیعت کیوں اور کیسے مائل ہوتی ہے، کیسی فضا، کیسا ماحول، کیسا موسم، فکرِ سخن کے لئے زیادہ سازگار ہوتا ہے، اگلے وقتوں کے شاعر اس کا ایک ہی سیدھا سا جواب جانتے تھے یعنی

"تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں"

یا "نہ رہی بات وہ مضمون سجھانے والی" لیکن یہ تو غالب نے خود ہی تسلیم کیا ہے کہ تصوّرِ جاناں کے لئے فرصت کے رات دن بھی شرط ہیں اور شعر لکھنے کے لئے صرف جسم کی فرصت یعنی دوسرے کام کاج سے فراغت ہی کافی نہیں، دل دماغ کی فرصت اور یکسوئی بھی ضروری ہے جب آدمی دل و دماغ کے باقی کھڑکیاں دروازے بند کر کے صرف فکرِ سخن کا ایک دریچہ کھلا رکھ سکے۔ گھر میں تو یوں ہوتا ہے کہ ادھر کسی نظم کا کوئی ہیولیٰ ذہن میں تلملانے لگا تو دفتر جانے کا وقت ہو گیا، یا غزل کی کسی زمین، کسی مصرعے کا سُر ہاتھ آیا تو ملنے والے آ گئے۔ یہ وقت نکل گیا تو اسی کیفیت کو واپس آنے میں کبھی دن کبھی مہینے لگ گئے اور کبھی طبیعت دوبارہ ادھر مائل ہی نہیں ہوتی۔ سوویٹ یونین میں یہ ہے کہ گردشِ دوراں اور کشمکشِ روزگار سے چند روزہ نجات ہیں اور مصروفیتوں

کے باوجود فرصت اور یکسوئی کے ایسے چند لمحے ہاتھ آہی جاتے ہیں، اور اس فرصت کے ساتھ ساتھ غم دوراں اور غم جاناں دونوں سے وہ دوری اور فاصلہ بھی کہ آدمی ایک تماشائی کی طرح ان کا سکون سے نظارہ کرسکے۔ شعر لکھنے کے لئے غالباً محسوسات کی دنیا سے قرب اور دوری، ربط اور علاحدگی، فکر اور سرخوشی INVOLVEMENT اور DETACHMENT دونوں ضروری ہیں۔ اور وہ کیفیت بھی جسے صوفیاء کی اصطلاح میں "انشراحِ قلب" کہتے ہیں۔ جب یوں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے اور حسنِ عالم کے درمیان غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا۔ کبھی ماسکو میں کسی دوست کے گھر کی بالکونی پر بیٹھے ہوئے، کبھی عشق آباد میں اپنے ہوٹل کی چھت پر، کبھی لینن ہلز سے شہر کو تکتے ہوئے، ایسی کیفیت اکثر دل پر گذری ہے۔ یہاں کے لکھے ہوئے اشعار میں ماسکو کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ سب اسی کیفیت پر گواہ ہیں۔ اور شاید سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہاں کے باکمال اہلِ سخن کی صحبت میں اظہار کے کئی نئے پیرائے، لیلائے سخن کے کئی نئے روپ ذہن میں اجاگر ہوتے رہے جن کو شعر میں ڈھلنے کی انگیخت ہوتی رہی۔ مثلاً انتساب والی نظم جو وقتاً فوقتاً کئی مہینوں تک لکھی جاتی رہی اس کا کوئی بند ماسکو میں ہوا ہے، کوئی سوچی میں، کوئی لندن اور کوئی کراچی میں۔ یہ نظم دراصل پابلو نرودا کی صحبت سے ذہن میں آئی تھی اور انہی کے تتبع میں لکھی گئی۔ "رنگ ہے دل کا مرے"، "آہستہ" اور ایک دو نظموں میں ناظم حکمت کا عکس ہے۔ آندرے وزنیز نسکی کی نظموں کا بہت اچھا انگریزی ترجمہ ان کے ہاتھوں ملا تو ایک نظم ان کے رنگ میں لکھی۔ اور رسول حمزہ کا کلام تو اتنا مانوس ہو گیا کہ میں نے قریب قریب ایک ہی نشست میں ان کی چند نظموں کا ترجمہ مکمل کر لیا جو اس باب میں درج ہے، اولجاز سلیمان سے ملاقات کو بہت دن نہیں گزرے، آج کل ان کے اشعار پیشِ نظر ہیں اور ان سے لطف و بصیرت حاصل کر رہا ہوں۔

جب تیری سمندر آنکھوں میں

یہ دھوپ کنارا شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں رار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سُکھ سوئیں گے، گھر در والے،
اور راہی اپنی راہ لے گا

۱۹۶۳ء

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر، شیشۂ مے، شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ،
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے،
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے ایک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر، شیشۂ مے، شیشۂ مے

اگست ۱۹۶۳ء

تم مرے پاس رہو

میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیاہ رات چلے
مرہمِ مشک لئے، نشترِ الماس لئے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لئے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو،
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو

۱۹۶۳ء

منظر

رہ گزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا آہستہ
حلقۂ بام تلے سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل،
نیل کی جھیل،
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتّے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا آہستہ
شیشہ و جام صراحی ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ
دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ
تم نے کہا آہستہ
چاند نے جھک کے کہا
اور ذرا آہستہ

۱۹۶۲ء

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا، زرد پتّوں کا بن

زرد پتّوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقاں کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی

جن کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجّیاں ہو گئیں
ان دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچّے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منّتوں زاریوں سے بہلتے نہیں
ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گُل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھِل کھِل کے
مرجھا گئے
ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے
بیواؤں کے نام
کٹڑیوں[۱] اور گلیوں محلّوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند
راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

۱۔ کٹڑی کٹڑے کی تصغیر۔ پنجابی میں طبقہ مکانوں کو کہتے ہیں۔

آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بُو
طالب علموں کے نام
وہ جو اصحابِ طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لئے ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم جو بھول پن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے
جہاں بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے
ان اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گُل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے

۶۷، ۶۱۹۶۲

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
اس خیاباں میں
جو اس لحظہ بیاباں بھی نہیں
کون سی شاخ میں پھول آتے تھے سب سے پہلے
کون بے رنگ ہوئی رنج و تعب سے پہلے
اور اب سے پہلے
کس گھڑی، کون سے موسم میں یہاں
خون کا قحط پڑا
گُل کی شہ رگ پہ کڑا
وقت پڑا
سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو
یہ بھرا شہر جو اب وادیٔ ویراں بھی نہیں
اس میں کس وقت کہاں
آگ لگی تھی پہلے
اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل
زہ ہوئی سُرخ شعاعوں کی کماں

کس جگہ جوت جگی تھی پہلے

سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو

ہم سے اس دیس کا تم نام نشاں پوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گزشتہ کی طرح
روبرو آنے سے جی گھبرائے
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبوب یا محبوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بِتانے کے لئے
ہم اب اس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لئے
دل کی کیا پوچھتے ہو

سوچنے دو

ماسکو ۱۹۶۷ء

اکتوبر انقلابِ روس کی سالگرہ

مرغِ بسمل کے مانند شب تلملائی
افق تا افق
صبحِ محشر کی پہلی کرن جگمگائی
تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹاتے گئے
دل جلاتے گئے

طبق در طبق
آسمانوں کے در
یوں کھلے ہفت افلاک آئینہ سا ہو گئے
شرق تا غرب سب قید خانوں کے در
آج وا ہو گئے
قصرِ جمہور کی طرحِ نو کے لیے آج نقشِ کہن
سب مٹاتے گئے
سینۂ وقت سے سارے خونیں کفن
آج کے دن سلامت اٹھاتے گئے
آج پائے غلاماں میں زنجیرِ پا
ایسے چھنکی کہ بانگِ درا بن گئی
دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی
ایسے چمکی کہ تیغِ قضا بن گئی

ماسکو ۵ نومبر ۱۹۶۷ء

عشق آباد کی ایک شام

جب سورج نے جاتے جاتے
عشق آباد کے نیلے افق سے
اپنے سنہری جام
میں ڈھالی

سرخیِ اوّلِ شام
اور یہ جام
تمہارے سامنے رکھ کر

تم سے کیا کلام
کہا پُر نام
اٹھو
اور اپنے تن کی سیج سے اٹھ کر
اک شیریں پیغام
ثبت کرو اس شام
کسی کے نام
کنارِ جام
شاید تم یہ مان گئیں
اور تم نے
اپنے لبِ گلفام

کتے انعام
کسی کے نام
کنارِ جام
یا شاید تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر
تھیں یوں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام
عشق آباد کے نیلے افق پر
غارت ہو گئی شام

عشق آباد، ۱۹۷۲ء

قحطِ وفا

ہم کیا کرتے، کس رہ چلتے
ہر رہ میں کانٹے بکھرے تھے
ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
ان صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کرکے ٹوٹ گئے
جس سمت گئے جس راہ چلے
یوں پاؤں لہو لہان ہوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے کیوں قحطِ وفا کا
ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو
یہ راہیں جب اٹ جائیں گی
سو رستے ان سے پھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

جولائی (ربگا) ۱۹۷۳ء

موری ارج سنو

"میری ارج سنو

دست گیرِ پیر"

"مائی ری کہوں کاسے میں

اپنے جیا کی پیر"

"نیّا باندھو رے

باندھو رے کنارِ دریا"

"مورے مندر اب کیوں نہیں آتے"

اس صورت سے

عرض سناتے

درد بتاتے

نیّا کھیتے

منت کرتے

رستہ تکتے

کتنی صدیاں بیت گئی ہیں

اب جا کر یہ راز کھلا ہے

جس کو تم نے عرض گزاری

جو تھا ہاتھ پکڑنے والا

جس جا لاگی ناؤ تمہاری

جس سے دکھ کا دارو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمہیں تھے
وہ تو تمہیں تھے

کراچی، ماسکو ۱۹۷۵ء

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو پایا ہے کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنّا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا
اب کیوں اس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف خطر سے در گزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے

گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا

ماسکو، ۱۹۷۵ء

رسول حمزہ توف کے تراجم

میں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں
کوئل دھوم مچاتے، میں تیرے سپنے دیکھوں
آتے اور اڑ جاتے، میں تیرے سپنے دیکھوں
باغوں میں پتے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
شبنم کے موتی دہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں

اس پیار میں کوئی دھوکا ہے
تو نار نہیں کچھ اور ہے شے
ورنہ کیوں ہر ایک سمے
میں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا
اسٹالن گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا
میری ماں اب بھی لئے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم
اور اس دکھ سے میری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر بڑے بھائی سے کچھ بڑھ کر ہے

داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی ہوں
اب وہ شاعر بنا ہے نام خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آبا کہ تھے نا محرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں
مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
ترے در پہ آکے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب
تو ترے حضور میں آرہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم
میں دوبارہ پھر سے روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشنِ سالگرہ ہے، شراب لا
دولت ہو یا خطاب، انہیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرعہ کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

چٹان کے لئے کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

نکولائی تیخونوف

مرزا ترسون زادہ

اناتولی سفرونوف

ناظم حکمت

تاشقند کا ایک منظر

تاشقند میں نوائی نای تھیٹر

تاشقند کی ریاستی یونیورسٹی

تاشقند علاقے میں ایک پنچایتی فارم کی بستی

تاشقند میں وہ مکان جو ماسکو والوں نے
زلزلے کے بعد بنائے ہیں

ازبکستان میں کپاس کے انبار
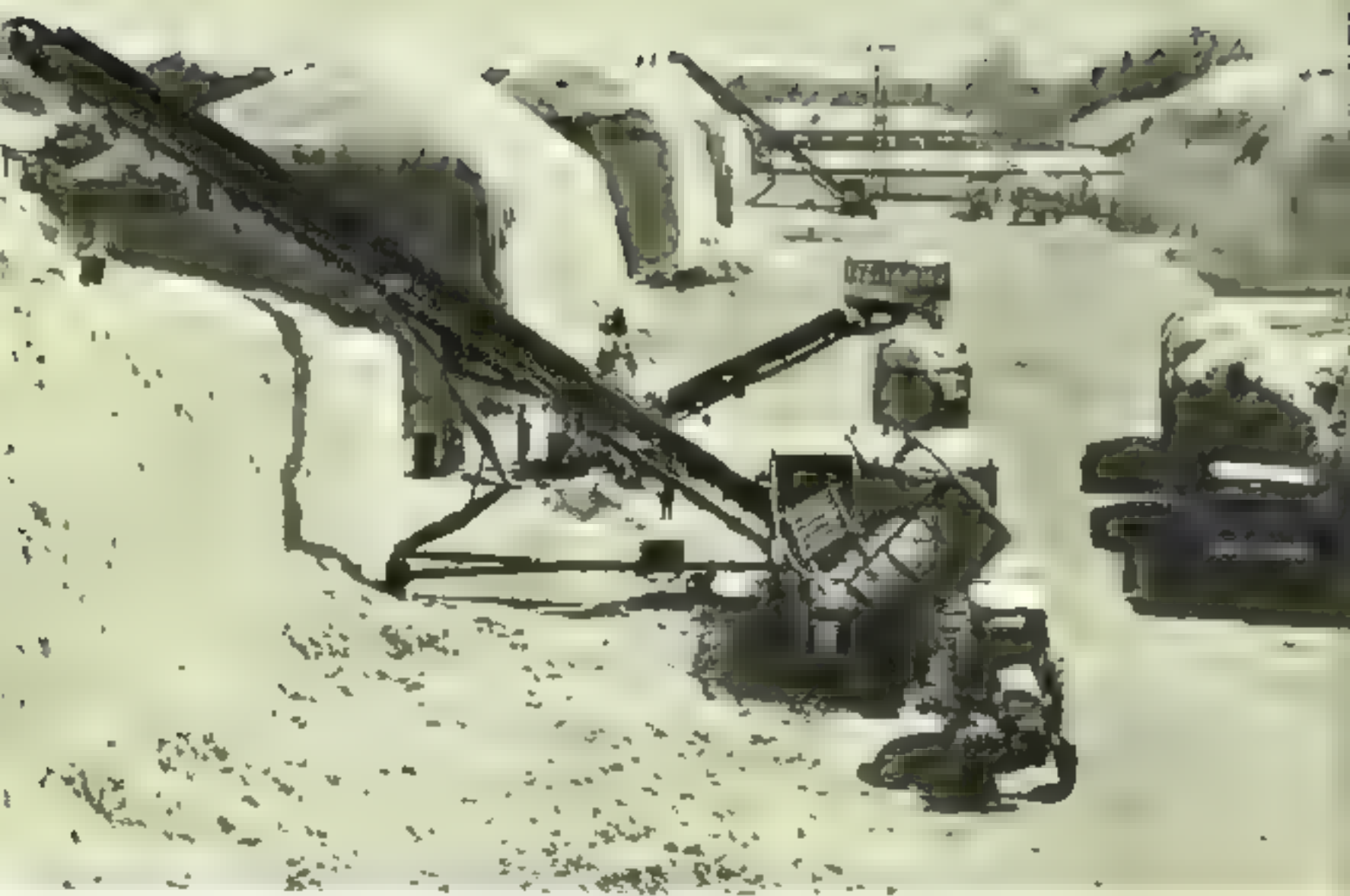
ازبکستان میں ایک پنچائتی فارم کا تہذیب محل

سوویت یونین کی اعلیٰ سوویت کے رکن خدائے نزاروف
ایک ماہر زراعت اور پنشن یافتہ سے بات کر رہے ہیں

ازبک نوبیاہتا جوڑا
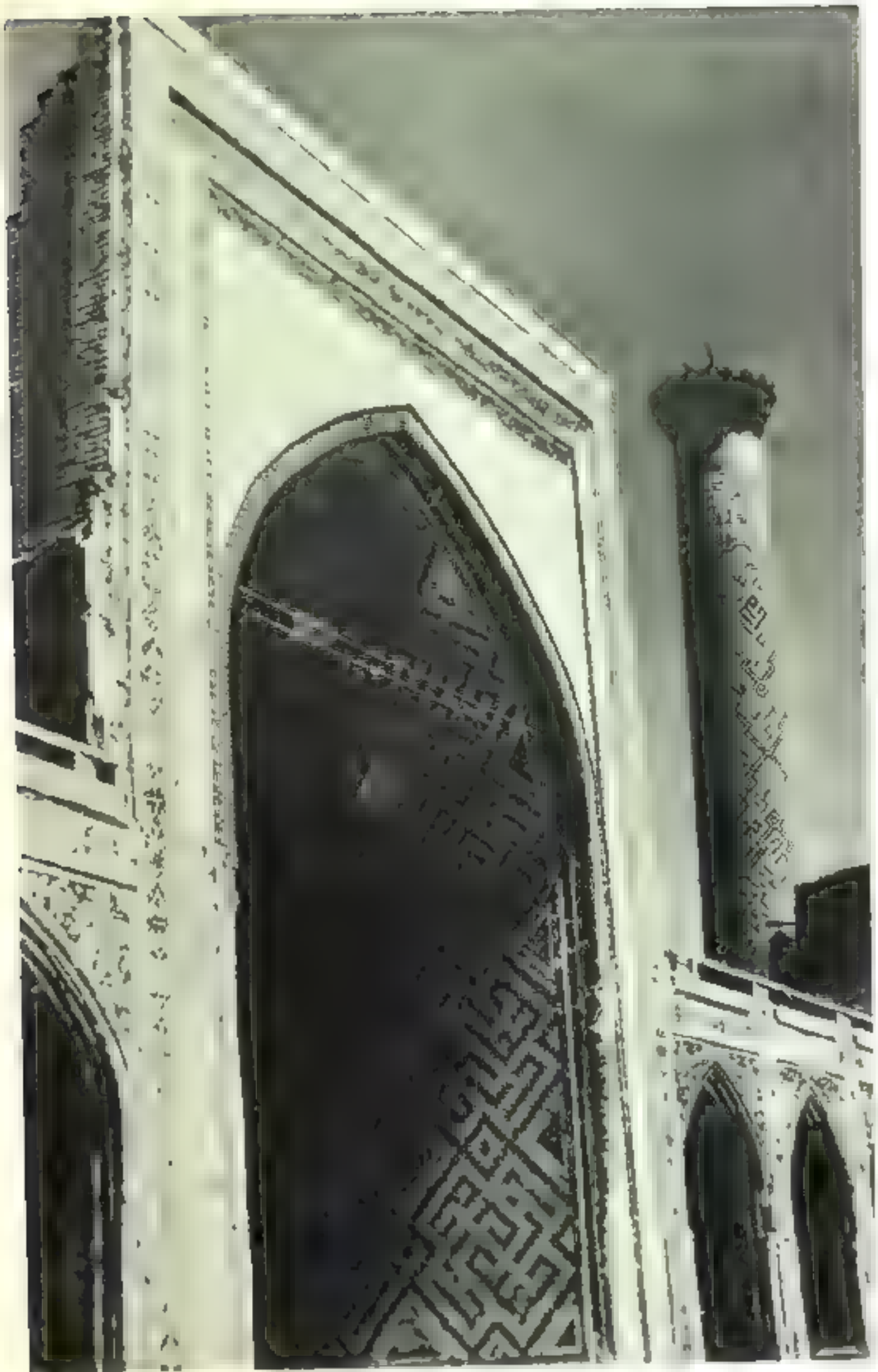
سمرقند میں مدرسۂ الغ بیگ (۱۵ویں صدی)
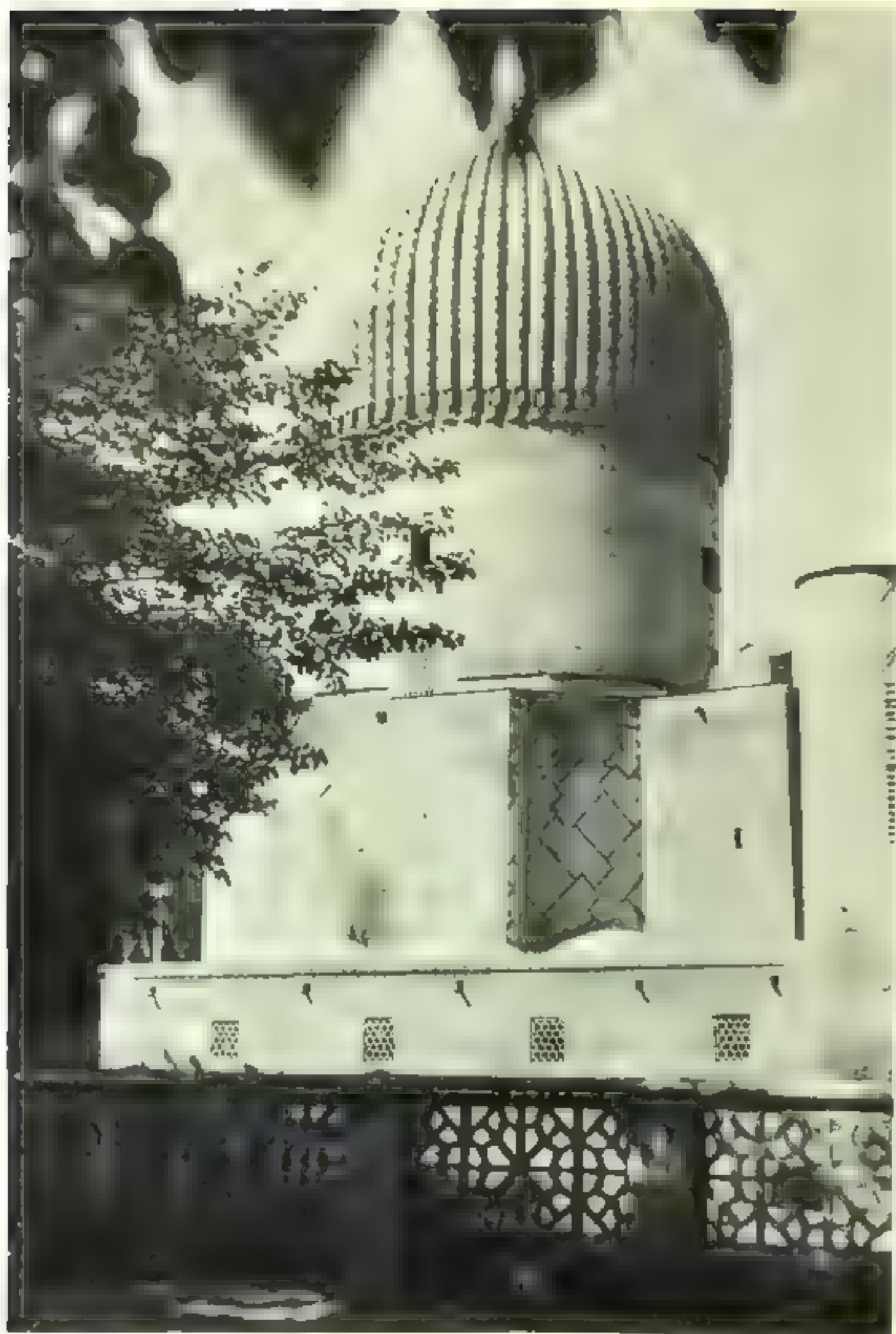
سمرقند میں تیمور خاندان کا مقبرہ گور امیر (۱۳۹۹ء—۱۴۰۴ء)

سمرقند میں اخوند بابایف چوک

بخارا میں کلاں مینار اور ابن سینا کی لائبریری

بخارا میں سامانی مقبرہ (نویں دسویں صدی)

دوشنبہ میں زراعتی انسٹی ٹیوٹ کے سامنے رودکی کی یادگار

دوشنبہ میں عینی نامی تاجک اوپیرا اور بیلے تھیٹر

عینی نامی تھیٹر میں "لیلا و مجنون" بیلے کا ایک منظر

دوشنبہ میں ایک ہسپتال

دوشنبہ میں ابن سینا نامی طبی انسٹی ٹیوٹ

تبلیسی کی ایک سڑک پر دو سہیلیوں کی ملاقات

تبلیسی کا ایک منظر

تبلیسی کے طلبا

جارجیا میں ایک پہاڑی گاؤں
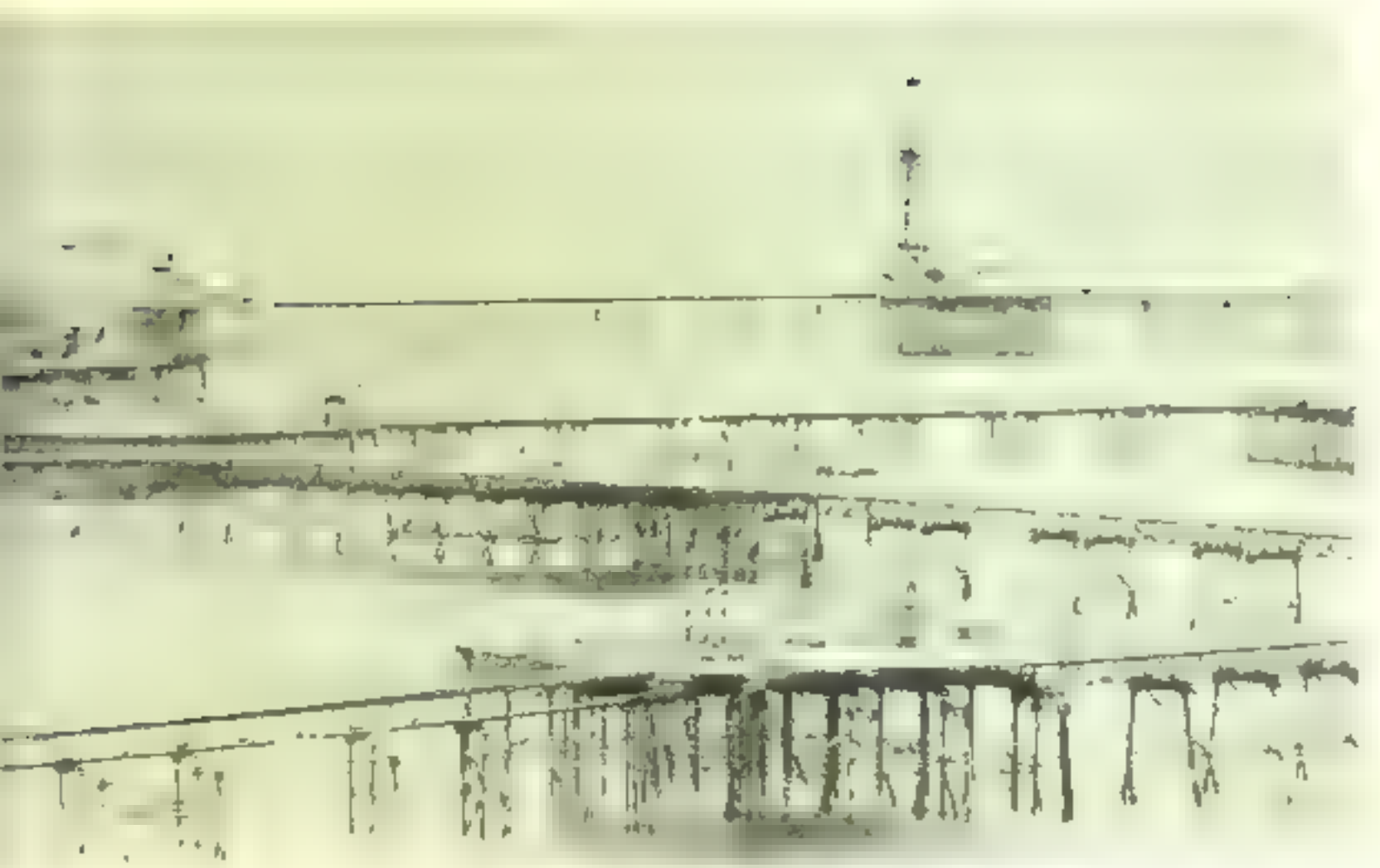
باکو کے قریب سمندر میں تیل کے کنویں
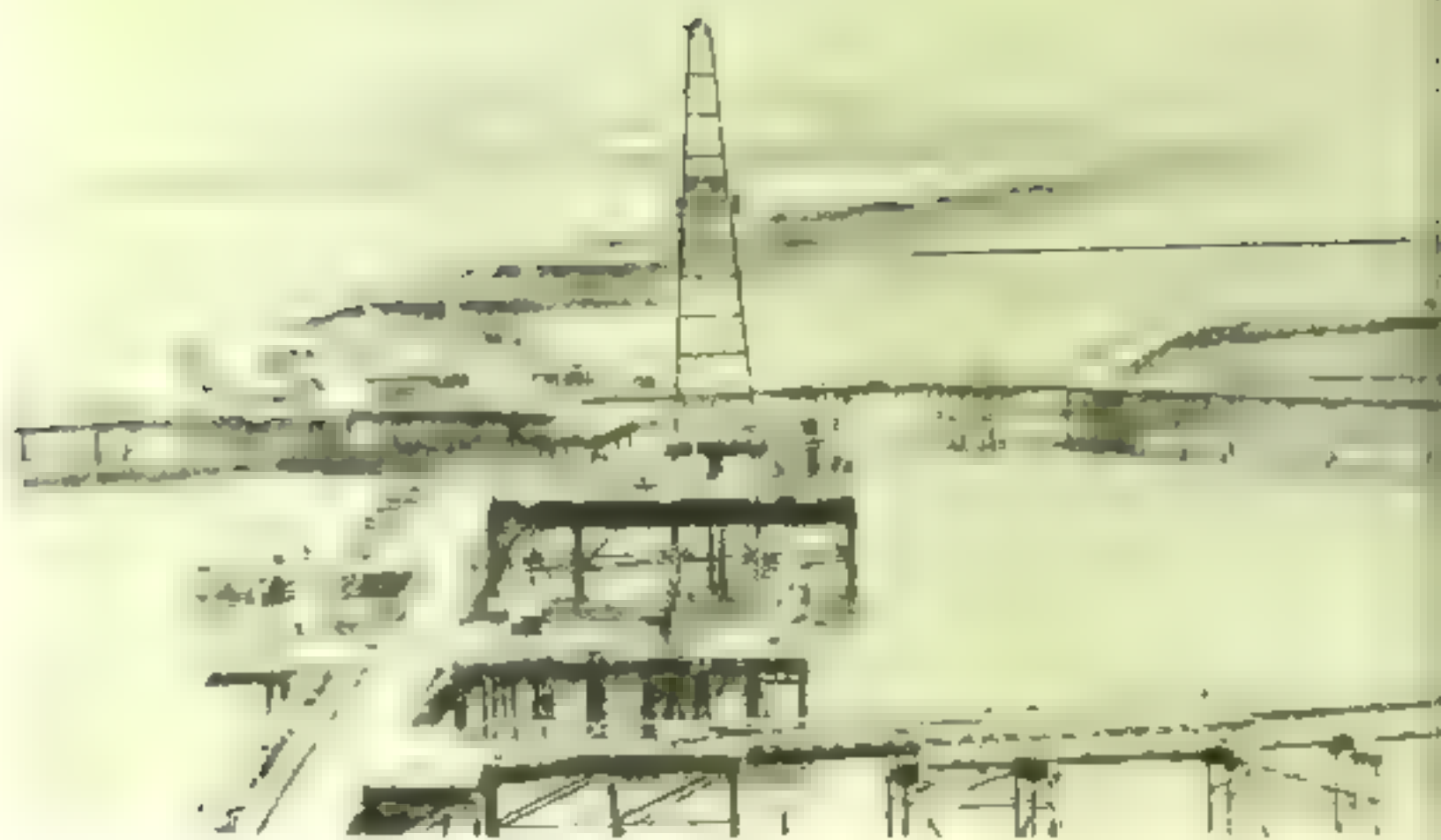
باکو میں ایک پرانی مسجد

باکو کا ایک منظر

ماسکو کا کریملن

ماسکو میں لومونوسوف نامی ریاستی یونیورسٹی

ماسکو کا ایک نیا رہائشی علاقہ
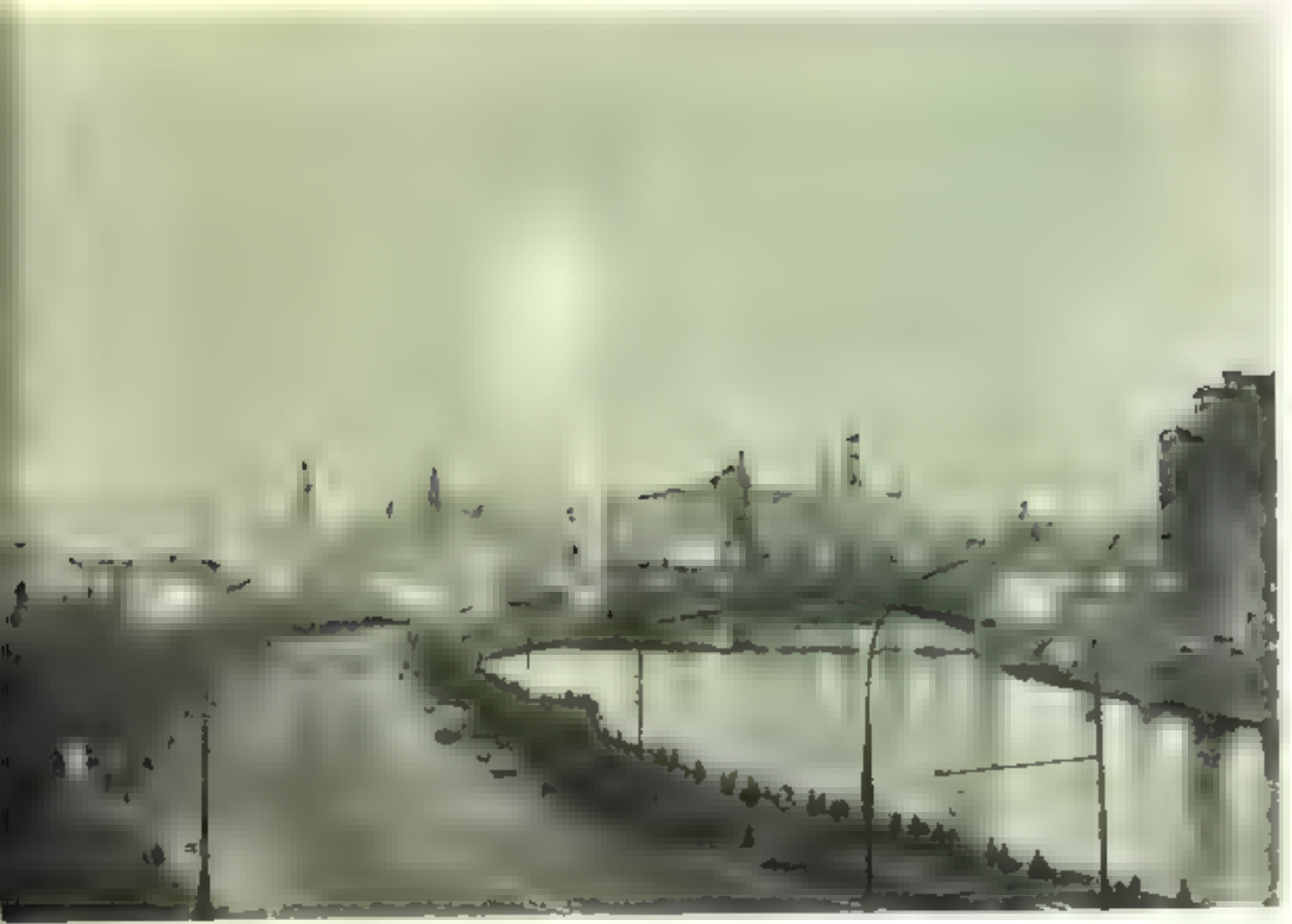
ماسکو میں سلامی و آتش بازی

ماسکو کی کالینن سڑک

ماسکو کے ایک بازار میں

ماسکو کی ایک سڑک پر

ماسکو میں بہار کی آمد
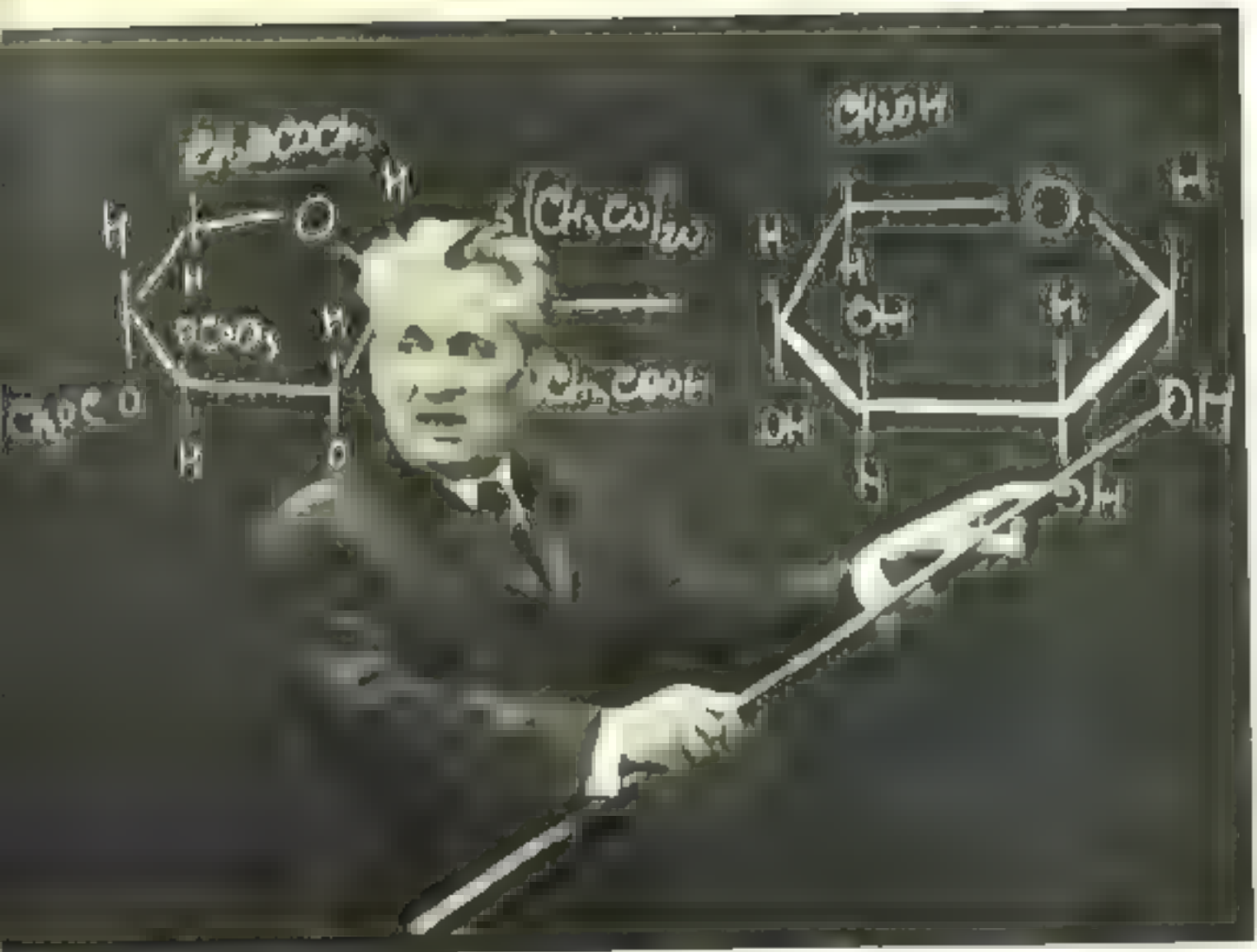
پروفیسر پروستاکوف لیکچر دے رہے ہیں

ماسکو کی لومبا نامی دوستی یونیورسٹی میں

ماسکو کے لال چوک میں لینن کا مقبرہ
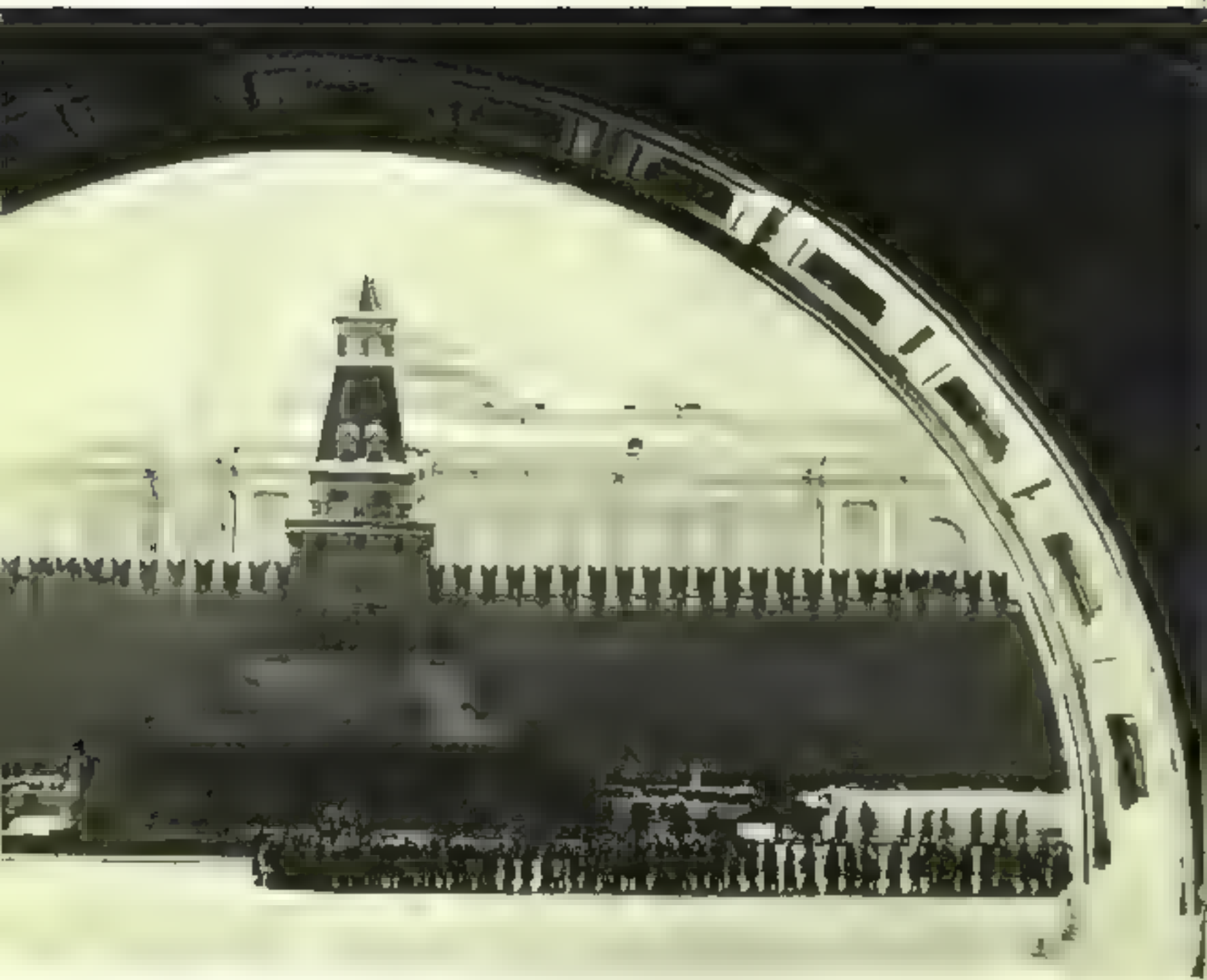
ماسکو کے ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور میں
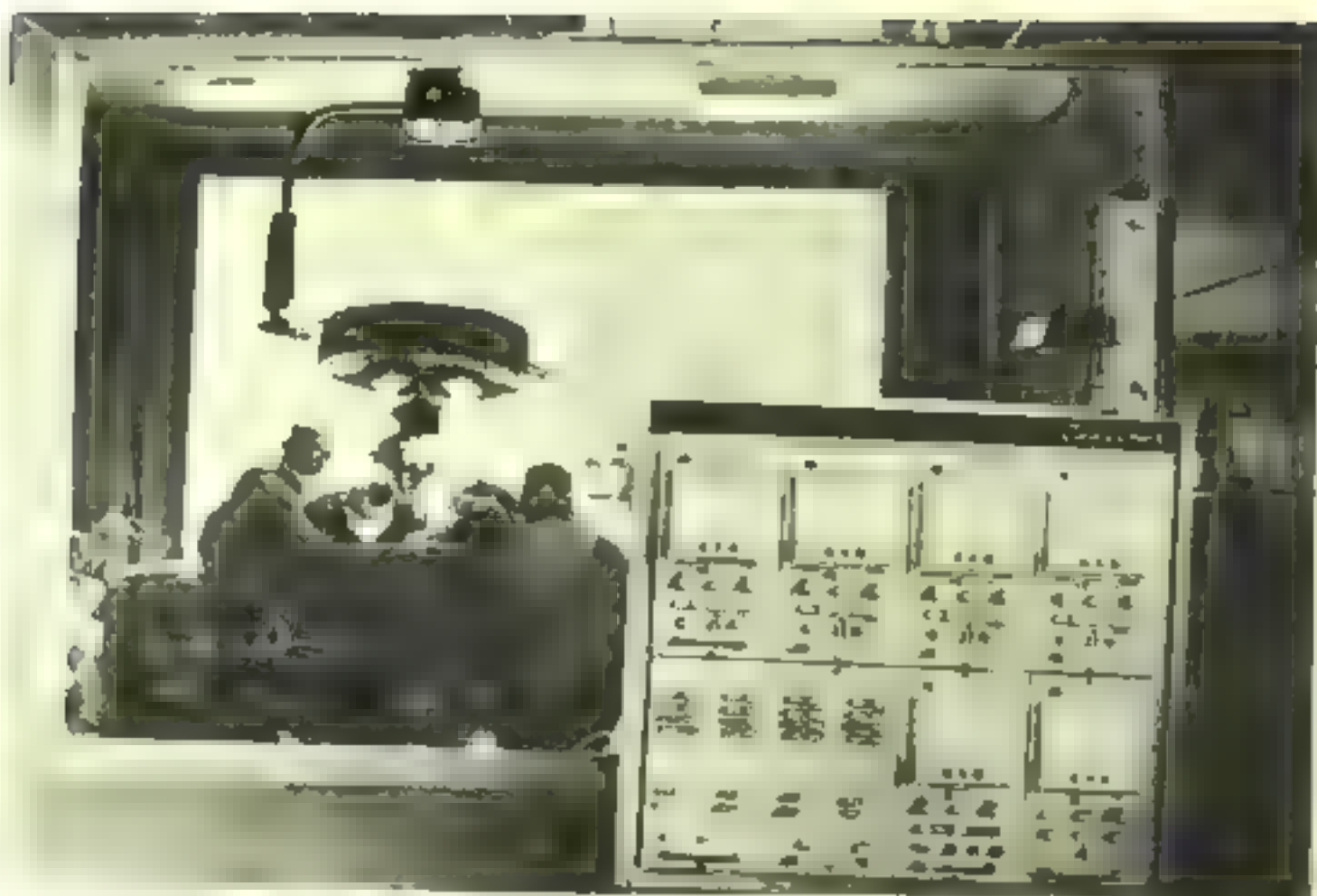
ماسکو کے ایک ہسپتال میں آپریشن ہو رہا ہے

ماسکو کے علاقے میں ایک پائنیر کیمپ

کرائمیا میں مصنفوں کی آرام گاہ

بحیرۂ اسود کا قفقازی ساحل (پیتسوندا)

سائبیریا میں براتسک پن بجلی گھر

ماسکو کی گورکی سٹرک رات کے وقت

برازیل کے مصنف پابلو نرودا

داغستان کے صدر مقام مہاچ قلعہ میں ایک ہوٹل

سائبیریا کے ٹائیگا میں شکاری

نوواسی برسک میں سائنس اکاڈمی کی بستی

نوواسی برسک کا ایک منظر

سائبیریا میں جھیل بیکال

الیا اہرن برگ

اولجز سلیمانوف

رسول حمزہ توف گلہ بانوں کے ساتھ

ژاں پال سارتر اور سیمون دبووآر
مولدادیہ کے مصوروں سے مل رہے ہیں

شہر چینتا میں کتابوں کا بازار

داغستان میں غنیب گاؤں

دن اور رات

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نور
اک شکاری ہے دن، اک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دور
مچھلیوں کی طرح ابنِ آدم کی ذات
جگ سمندر ہے، ساحل پہ ہیں ماہی گیر
جال تھامے کوئی، کوئی بھالا لیے
میری باری کب آئے گی کیا جانیے
دن کے بھالے مجھ کو کریں گے شکار
رات کے جال میں یا کریں گے اسیر؟

نسخۂ الفت میرا

گر کسی طور ہر اک الفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رخِ جانانہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مرے شعر و سخن کا دفتر
طولِ میں طولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ الفت میرا
اس سبب سے کہ ہر اک لمحۂ فرصت میرا
دل یہ کہتا ہے کہ ہر قربتِ جاناں میں بسر

امدادی فنڈ کے لئے سفارش

فنڈ والوں سے گزارش ہے کہ کچھ صدقۂ زر
سائل محولہ بالا کو ملے بار دگر
پوچ لکھتے ہیں جو وہ لکھتے ہیں تسلیم مگر
ان کی اولاد و اعزاء کو نہیں اس کی خبر
آلِ بیہودہ نویساں کے لئے نانِ جویں
ٹالسٹائے کے گھرانے سے اہم کم تو نہیں

الجبار، عمر علی، سلیمان (سلیمونوف)

صحرا کی ایک رات

کہیں بھی شبنم، کہیں نہیں ہے
عجب کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سرد سورج کی آستین پر
کسی لبادے، کسی جبیں پر
کہیں بھی شبنم، کہیں نہیں ہے
پسے ہوئے پتھروں کی موجیں
جو وقت کی طرح پر سکوں ہیں
تپش میں ماہتاب نیم شب کی
بری طرح تپ رہی ہیں لیکن
کہیں بھی شبنم، کہیں نہیں ہے
برہنہ پا، غول، گیدڑوں کے
لگا رہے ہیں بنوں میں ٹھٹھے
کہ کوئی شبنم، کہیں نہیں ہے
ہول کے استخواں کی چیخیں
فضا میں فریاد کر رہی ہیں
کہ کوئی شبنم، کہیں نہیں ہے
کہیں کہیں مگجے سپیدے نے
خشک صحرا کی چھاتیوں پہ سے

ایسے پردہ اٹھا دیا ہے
کہ اس کے تو دوں، پیاسے تو دوں کا حسن
انساں سے بھی سوا ہے

یہ چاند پھر سرد ہو رہے گا
کہیں سے اک صبح کا کنارا
بھڑک کے پھوٹے گا اس کرن سے
کہ اک فسردہ، اکیلے انساں
کے رخ پہ شبنم کی تاب چمکے

لیلۃ القدر

رات کا وقت
گرمی
بزرگ آدمی
جا نمازوں پہ سرگوشیاں کر رہے ہیں
ایک ابرو اٹھا کر
انہیں چاند حیرت سے تکتا ہوا
اور منہ زور دریا کے پاؤں تلے
آبشاروں تلے
چٹانیں ہمیشہ سے دن رات
جیسے وضو کر رہی ہیں
سبھی لوگ اپنے خدا کے حضور
اپنی جائز امنگیں بیاں کر رہے ہیں
دعا کر رہے ہیں
کہ یہ رات، عرض و مناجات کی رات ہے
دعائیں سنے جانے کی رات ہے
مسلماں دعا کر رہے ہے
کہ دنیا کی خوشیوں سے کچھ ہم کو بھی!
راہ گزاروں پہ کچھ روشنی چھن چکی

اور گردِ راہ
ریشِ بابا کی صورت
اڑی جا رہی ہے
کچّی دیوارِ مسجد کی خاموش ہے
اس کا بوسیدہ مینار
تلوار سا ایک خم دار
سایہ سنبھالے ہوئے
طفل یوں سامنے سے گزرتے ہوئے
جیسے گزرے ہوئے ماہ و سال
سبزہ زاروں میں بسی ہوئی آب جو
چھچھاتی ہوئی
جیسے ریشم کی دستار کے سارے بل کھل گئے ہوں
سیب کے پیڑ
پانی کے مٹیالے بالوں میں اپنی جڑیں دھو رہے ہیں
یہ دعائیں سنے جانے کی رات ہے
اور میں بھی بزرگوں کے مانند
سڑکوں کے سیمنٹ
کی جانمازوں پہ چلتے ہوئے
زیرِ لب کچھ دعا کر رہا ہوں
اور یہ دعا تیرا نام ہے
کاش میری دعا آج مقبول ہو

ناظم حکمت

ویرا کے نام

اس نے کہا آؤ
پھر اس نے کہا ٹھہرو
مسکاؤ کہا اس نے
مرجاؤ کہا اس نے
میں آیا
میں ٹھہر گیا
مسکایا
اور مر بھی گیا

بھوکوں کی آنکھیں

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو

نہ ایک ہزار

قحط کے مارے پورے تین کروڑ

ایسے ہیں یہ اپنے لئے

ان کے لئے ہم ایسے ہیں

جیسے لہریں

ساگر کے لئے

یا ساگر

لہروں کے لئے

ایک نہ دو، دس بیس نہ سو،

نہ ایک ہزار

قحط کے مارے تین کروڑ

صف در صف،

ان میں کوئی مرد نہیں

عورت بھی نہیں

لڑکا بھی نہیں

لڑکی بھی نہیں

سب چڑمڑ پیڑ ہیں سوکھے ہوتے
جو مرد نہیں
عورت بھی نہیں
لڑکا بھی نہیں
لڑکی بھی نہیں
سب چلتے پھرتے ڈھیلے ہیں
دھرتی کی سہانی مٹی کے
ان میں سے کوئی
اپنے گھٹنے کھڑکاتا ہے
کھڑکاتا ہے
کھڑکاتا ہے
یا پھولا پیٹ کوئی
بجتا ہے
کبھی دب جاتا ہے
ان میں سے کوئی
بس اک چمڑے کی تھیلی ہے
جس کی جان
فقط آنکھوں میں باقی ہے
جوتوں کے کیل
دھنسے ہیں زخمی تلووں میں
اور دل کا لہو

سب بچھڑ گیا ہے آنکھوں میں
بے اندازہ دکھ
جو گھورتا ہے
اور گھورتا ہے
اپنا دکھ بھی
ان کے دکھ کی طرح
بے انت ہے، بے اندازہ ہے،
پھر بھی ہم
ہمت سے منہ نہ موڑیں گے
ہم نے دل مضبوط کئے ہیں
اور سینے فولاد
ان بھوکے تین کروڑ کی خاطر
جن کی پاگل آنکھیں
اپنا غم ہے، اپنا دکھ ہے۔
اور سننے والو!
سنتے ہو
گر دل کی بات کہی میں نے
کیا مجھ کو خبطی کہتے ہو
اوروں کی طرح
گر تم بھی بزدل ہو
اور سوچتے ہو

میں پگلا ہوں، واہی بکتا ہوں،
تو دیکھو
میری آنکھوں میں جھانک کے دیکھو،
آنکھیں اک درد کے مارے کی
جو درد کے ہاتھوں پاگل ہے

جیل سے خط

۱

مری جان، اک ضروری بات کہنی ہے مجھے تم سے
بدل جاتا ہے خود انساں جو اس کا گھر بدلتا ہے
میں اس زنداں میں اب مرنے لگا ہوں اپنے خوابوں پر
جو نیند آتی ہے
اپنے دستِ شفقت سے
مری زنجیر وا کرنے
تو ڈھے جاتی ہیں دیواریں
پرانی بات ہے پھر بھی
میں کھو جاتا ہوں ایسے اپنے خوابوں میں
کہ جیسے پُر سکوں پانی میں
سورج کی کرن اترے
بہت دلکش ہیں میرے خواب، میری جاں
وسیع، شاداب دنیا میں
بہت خوش اور آزادانہ پھرتا ہوں
مرے خوابوں میں کوئی نیستی کا دکھ نہیں ہوتا
نہ کوئی پل کسی زنداں میں گزرا ہے
"تو پھر اس خواب سے اٹھنا، تمہیں کتنا گراں ہوگا"

شاید کہوگی تم،
نہیں، جاں، یوں نہیں ہے،
مجھ میں اب بھی اتنی ہمّت ہے
کہ اپنی نیند کو اوقات سے اتنا ہی حصّہ دوں
جو میں چاہوں

۲

آج پیر کا دن ہے
اور آج پہلی بار
وہ مجھے باہر کھلی ہوا میں لے کر گئے
آج زندگی میں پہلی بار
میں نے بہت حیرت سے دیکھا
کہ آسماں کتنا نیلا ہے
اور کتنا دور
میں دھوپ میں ساکت کھڑا رہا
اور پھر ادب سے سر جھکا کر
پتّھر کی دیوار سے ٹیک لگا کر
بیٹھ گیا،
اور پھر یکبارگی سب کچھ بھول گیا،
خواہیں بھی

آزادی بھی
اور تم بھی مری جاں
بس اک سورج، دھرتی اور میں
اُف کتنا سکھ ہے، کتنا سکھ ہے

او میرے وطن

او میرے وطن
او میرے وطن
او میرے وطن
مرے سر پر وہ ٹوپی نہ رہی
جو تیری زمیں سے لایا تھا
پاؤں میں وہ جوتے بھی نہیں
واقف تھے جو تیری راہوں سے
مرا آخری کرتا چاک ہوا
ترے شہر میں جو سلوایا تھا
اب تیری جھلک
بس اڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی
یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے
یا جھرّیاں میرے ماتھے پر
وا میرے وطن
وا میرے وطن
وا میرے وطن

پاکستان کے مشہور شاعر اور سماجی کارکن فیض احمد فیض ۱۹۱۱ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ سیالکوٹ اور امرتسر کے کالجوں میں تعلیم پائی۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران وہ فوج میں کرنل کے عہدے پر رہے۔ پھر پاکستان ٹائمز اور امروز اخباروں کے چیف ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۶۲ء میں فیض کو قوموں کے درمیان امن استوار کرنے کے لئے لینن نامی بین الاقوامی انعام عطا کیا گیا۔

سلسلے وار کتابیں "سوویت یونین کے تاثرات"
دارالاشاعت ترقی - ماسکو